ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابو یحییٰ

اکتوبر ۲۰۱۹

www.inzaar.pk

October 2019

بڑا کام وہاں ہوتا ہے جہاں لوگ چھوٹا بننے پر تیار ہوجائیں
جہاں ہر شخص بڑا بننا چاہے وہاں بڑا کام نہیں ہوتا

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ابو یحییٰ کی نئی کتاب

بندگی کے سو رنگ

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''میں نے جن وانس کو اپنی بندگی ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔''، (الذاریات 56:51)

بندگی کی یہ دعوت اپنے اندر اتنے ہی رنگ لیے ہوئے ہے جتنے خود زندگی کے مختلف رنگ، پہلو اور گوشے ہیں۔ پیش نظر کتاب میں زندگی کے ان رنگوں کو بندگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اسی لیے اس مجموعہ مضامین کا نام ''بندگی کے سو رنگ'' رکھا گیا ہے۔

کتاب کا ہر مضمون وہ زاویہ نظر دیتا ہے جو ایک بندہ مومن سے اس کے مالک کو مطلوب ہے۔ چاہے اس کا تعلق زندگی کے فکری پہلو سے ہو یا عملی پہلو سے۔ بندگی کی سوچ مومن کی فکر و عمل کے ہر رنگ کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ بندے کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر رنگ کو مالک کے بنائے ہوئے کینوس (canvas) کے پس منظر میں دیکھے۔

اس طالب علم کو یقین ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے بعد آپ کی زندگی بندگی کے رنگوں میں انشاءاللہ رنگ جائے گی۔ یہی اس کتاب کا مقصد تصنیف ہے۔

ابو یحییٰ

ماہنامہ

اِنذار

صفر 1441ھ — اکتوبر 2019ء

جلد 7 شمارہ 10

مدیر:
ابو یحییٰ ریحان احمد یوسفی

سرکولیشن مینیجر:
غازی عالمگیر

معاون مدیر:
عابد علی، بنت فاطمہ، سحر شاہ، عظمیٰ عنبرین

معاونین:
محمد شفیق، محمود مرزا

فی شمارہ — 25 روپے
سالانہ: کراچی (بذریعہ کوریئر) 500 روپے
بیرون کراچی (نارمل پوسٹ) 400 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر یا ڈرافٹ)
بیرون ملک 2500 روپے
(زرتعاون بذریعہ پوسٹل بیئرر آرڈر یا ڈرافٹ)
نارتھ امریکہ: فی شمارہ 2 ڈالر
سالانہ 24 ڈالر

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201, 0345-8206011
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

مشنری زندگی اور مشینی زندگی

لوگ روزانہ صبح ملازمت، کاروبار، تعلیم وغیرہ کے لیے باہر جاتے ہیں۔ اس دوران میں ان کی بیویاں، مائیں یا بہنیں بھی ان کے ساتھ بیدار ہوکر ان کو تیار ہونے میں مدد دیتی ہیں۔ مگر لوگوں کا یہ روزانہ صبح اٹھنا اور گھر سے نکلنا ایک میکانکی عمل ہوتا ہے۔ لوگ اپنے اس معمول کے عادی ہوتے ہیں۔ اس معمول میں کوئی جوش یا کوئی جذبہ ہرگز نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پورے جوش کے ساتھ صبح کے وقت بیدار ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے سامنے کوئی ہدف اور کوئی مقصد ہوتا ہے۔ اس کی ایک مثال وہ نوجوان ہے جس کا صبح امتحان ہوتا ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ بستر سے اٹھتا ہے اور ناشتے وغیرہ سے فارغ ہوکر فوراً اپنے تعلیمی ادارے کے لیے نکل جاتا ہے۔ تاہم امتحان کے بعد یہ جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور پھر وہی جوش سے عاری معمول شروع ہو جاتا ہے۔

تاہم اگر کوئی شخص اپنی زندگی کا ایک ہدف بنالے تو پھر اس کی ہر صبح اسی جوش و جذبے کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔ وہ ہر روز اپنے ہدف کی طرف ایک قدم بڑھاتا ہے اور ایک روز وہ اپنی منزل پالیتا ہے۔ پھر وہ اپنا ایک نیا ہدف طے کرتا ہے اور تیزی سے اس کی طرف پیش قدمی شروع کردیتا ہے۔ جذبے سے عبارت یہی زندگی مشنری زندگی ہے۔ رہی پہلی قسم کی زندگی تو اس کے لیے مشینی زندگی کی تعبیر زیادہ موزوں ہے۔

جو لوگ مشینی زندگی گزارتے ہیں وہ اپنی ذات سے آگے نہیں بڑھ پاتے اور ایک روز بے کار ہوجانے والی مشین کی طرح دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔ جبکہ مشنری زندگی گزارنے والے لوگ اپنی ذات کے علاوہ دوسروں کو بھی بہت کچھ دے کر جاتے ہیں۔ جواب میں دنیا بھی انھیں عزت، محبت اور مقام دیتی ہے۔ یہی عزت والی زندگی اصل زندگی ہے۔

منزل

زندگی ایک سفر ہے اور موت اس سفر کی فیصلہ کن منزل ہے۔ یہ ہر ڈوبتے سورج اور ہر ڈھلتی شام کا پیغام ہے۔ یہ ہر جاتی شب اور آتی صبح کا پیام ہے۔ یہ ہر بکھرتی شفق اور ہر پھیلتی تاریکی کی یاددہانی ہے۔ یہ چاند کی ہر گھٹتی بڑھتی رات کی صدا ہے۔ یہ شب و روز کی داستان، بدلتی رتوں کی کہانی اور ماہ وسن کے قصے کا آخری سبق ہے۔

مگر انسان کائنات کے اس خاموش پیغام کو سننے کے لیے بہرا، اس واضح سبق کو دیکھنے کے لیے اندھا بنا رہتا ہے۔ سو انسانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے موت کو عام کر دیا گیا ہے۔ مگر انسان پھر بھی ہوش میں نہیں آتے۔ ہوس زر، حب دنیا، مال و جاہ کی دوڑ ختم ہو کر نہیں دیتی۔

مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ یہ بتا رہا ہے کہ اس پر حکمت کائنات میں انسان نہ دشتِ اتفاق سے آیا ہے اور نہ اس کا مقدر بحرِ عدم کی موجوں میں فنا ہو جانا ہے۔ انسان ایک حکیم و علیم ہستی کی تخلیق ہے۔ وہ ہستی عزیز و قدیر بھی ہے۔ وہ ایک روز انسان کو دوبارہ جی اٹھائے گی۔ اس روز انسان دیکھ لے گا۔ رائی کے دانے کے برابر عمل کو بھی دیکھ لے گا۔ اپنی تنہائی اور اپنے رازوں کو سب کے سامنے بے نقاب ہوتا دیکھ لے گا۔

یہ دن بڑی رسوائی کا ہو گا۔ ان کے لیے ہی نہیں جنھوں نے خدا کو پچھلی دنیا میں نہیں مانا۔ ان کے لیے بھی جنھوں نے خدا کو مانا مگر اس کی کتاب کو اپنا رہنما بنانے سے انکار کر دیا۔ وہ اپنے تعصّبات کے اسیر رہے۔ اپنے فرقوں کے غلام بنے رہے۔ اپنے خواہشات کے پیرو رہے۔

یہ دن بڑی عزت کا ہو گا۔ اپنے ہر تعصب سے بلند ہو کر سچا ایمان لانے والوں کے لیے۔ اپنی خواہش سے بلند ہو کر صبر اور تقویٰ کی راہ اختیار کرنے والوں کے لیے۔ جنت ایسے ہی خوش بختوں کا انجام ہے۔ فردوس ایسے ہی بلند حوصلہ لوگوں کا انعام ہے۔

کیا کشمیر پاکستان بنے گا؟

قوموں کے بارے میں خدا کا قانون بالکل واضح ہے۔ فرد کے لیے یوم حساب قیامت کا دن ہے، مگر قوموں کے لیے محشر یہی دنیا ہے۔ البتہ افراد کی طرح قوموں کا معاملہ بھی انھی کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے۔ اور فرد کی طرح ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ وہ بیج اخلاقی دنیا میں بوئیں گے، مگر فصل مادی دنیا میں کاٹنی ہوگی۔ یہی خدائی عدل کا پیمانہ ہے۔ ہاں اس قانون کا ایک اہم جز یہ ہے کہ یہاں غیر جانبداری اور خاموشی بھی جرم سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ سزا جب مسلط ہوتی ہے تو پھر وہ ظالموں ہی تک محدود نہیں رہتی۔ یہ اس قانون کا وہ پہلو ہے جس پر قرآن نے خاص طور پر متوجہ کیا ہے۔

ایسے میں مسئلہ کشمیر ہو یا پاکستان دونوں جگہ جو کچھ ہوگا اور ہو رہا ہے اس کا ذمہ دار کوئی اور نہیں ہم ہی ہیں۔ بس کچھ اخلاقی سوالات ہیں جو اپنے آپ سے کر لیجیے۔ جو جواب ملے اس کے آئینے میں آپ اپنے حال کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں اور مستقبل کا نقشہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔

ہمارے ایوان بالا میں ووٹ بکتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے ایوان عدل میں انصاف کے پیمانے ایک ہیں یا نہیں؟ ہمارے حکمران اپنی عہد شکنی کو یوٹرن سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے عُمّال کرپشن کو اپنا حق سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے طاقتور لوگ آئین کی وفاداری کی قسم کھا کر یہ قسم نبھاتے ہیں یا نہیں؟ ہمارے اہل مذہب فرقہ بندی اور گروہی تعصّبات کے اسیر ہیں یا نہیں؟ ہمارے دانشور، کالم نویس اور صحافی اپنے ذاتی مفادات اور شخصی پسند و ناپسند سے اوپر اٹھنے کو تیار ہیں یا نہیں؟ اور ہم سب جی ہاں ہم سب اپنی ذاتی زندگی میں عدل کرتے ہیں یا نہیں؟

انھی سوالوں کے سچے جوابات سے ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں ہمیں عزت ملے گی یا ذلت؟ سزا ملے گی یا جزا؟ ہم جیتیں گے یا ہاریں گے؟ کشمیر پاکستان بنے گا یا نہیں؟

حکمران بننے کی مشکل

کراچی ایک زمانے میں روشنیوں کا شہر ہوا کرتا تھا۔اب یہ سانحوں کا شہر ہے۔ابھی بارشوں میں کرنٹ لگنے سے مرنے والے درجنوں لوگوں کی خبر بھی پرانی نہیں ہوئی تھی کہ کراچی کے علاقے بہادر آباد میں ایک سترہ سالہ نوجوان کو جس پر چوری کا الزام تھا، تشدد کا نشانہ بنا کر ہلاک کر دیا گیا۔کسی اور مہذب ملک میں یہ واقعات حکمرانوں کی نیند اڑا دیتے مگر جس ملک کے عوام بے حس اور حکمران سنگ دل ہوں وہاں ایسے واقعات سے کسی کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔

تاہم ایسے تمام واقعات قیامت کے دن، وہ دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، بہت سے ایسے لوگوں کے لیے باعث عذاب ہوں گے جن کا بظاہر ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔مثلاً اسی واقعے کو لے لیجیے جس میں ایک طرف مقتول ہے اور دوسری طرف تشدد کرنے والے۔لیکن قیامت کے دن بہت سے دیگر فریق بھی اس مقدمے میں بلائے جائیں گے۔ پہلے یہ بات کھلے گی کہ لوگوں نے اگر اس نوجوان پر تشدد کیا تو اس کی وجہ ان کی یہ مایوسی تھی کہ کراچی میں آئے دن لوگ لٹتے ہیں، ان کے گھر ڈکیتیاں ہوتی ہیں، ان کی گاڑیاں چھنتی ہیں؛ مگر پولیس ملزمان کو پکڑنے کے بجائے انھیں تحفظ دیتی یا رشوت لے کر چھوڑ دیتی ہے۔

یہ مایوسی تشدد کرنے والوں کا عذر تو نہیں بنے گی لیکن روزِ قیامت اس مقدمے کی پیشی کے موقع پر ایسے تمام پولیس والوں کو بلا کر ان کے اپنے گناہوں کے ساتھ اِس قتل کے گناہ کا ایک حصہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ڈال دیا جائے گا۔دوسری حقیقت یہ سامنے آئے گی کہ پولیس اگر کبھی کسی مجرم کو پکڑ لیتی تو عدالتی نظام کی خرابیاں اور تاخیر مجرموں کو سزا دینے میں مانع ہو جاتی تھیں۔جس کے بعد ان تمام ججوں کو جو اس تاخیر کے ذمہ دار تھے، بلایا جائے گا اور ان کے اپنے گناہوں کے ساتھ اس قتل کے گناہ کا ایک حصہ بھی ان کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔

تیسری حقیقت یہ سامنے آئے گی کہ اس پورے نظام میں ذمہ داری سیاستدانوں اور خاص کر حکمرانوں کی ہے جو اپنی نااہلی اور مفادات کی بنا پر اس سسٹم کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ شہری، صوبائی اور وفاقی سطح کے ان تمام حکمرانوں کو جو اس صورتحال کے بالواسطہ یا بلاواسطہ ذمہ دار ہیں، اس قتل کے موقع پر بلایا جائے گا اور ان کے اپنے گناہوں کے ساتھ اس قتل کے گناہ کا ایک حصہ ان کے نامہ اعمال میں ڈال دیا جائے گا۔

یہ حکمران ایک دوسرے پہلو سے بھی اُس روز پکڑ میں آئیں گے۔ وہ یہ کہ مقتول نے اگر چوری کی تو غربت کی وجہ سے کی۔ اس غربت، بے روزگاری اور جہالت کی ذمہ داری حکمرانوں کی نااہلی اور لوٹ مار پر عائد ہوتی ہے۔ انھی کی پالیسیوں اور مفاد پرستی نے وسائل سے بھرپور ملک کو اس حال میں پہنچا رکھا ہے کہ وہ معاشی عدم استحکام کی دلدل میں دھنس چکا ہے۔

قیامت کے دن کوئی معاملہ سادہ نہیں ہوگا۔ انسان کو اپنے عمل ہی کا جواب نہیں دینا ہوگا بلکہ اس کے اعمال کے اثرات جتنی دور تک گئے ہوں گے، اتنا ہی سخت وہ اللہ کی پکڑ کی زد میں آ جائے گا۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منصب کی سختی پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ منصب قیامت کے دن رسوائی اور ندامت کا موجب ہوگا (بخاری، رقم 7148)۔

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی ذمہ داری کا کوئی بھی عہدہ یا منصب لینا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ انسان کو یہ احساس ہو جائے تو وہ حضرت عمر کی طرح اپنے زیر حکومت ایک پیاسے کتے کی موت سے بھی ڈرنے لگتا ہے، گرچہ درحقیقت وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ مگر جن لوگوں کو احساس نہیں ہوتا وہ عہدوں اور مناصب کے مزے اڑاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ قبر کے اس گڑھے میں پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ ہوں گے اور خدا کا عدل ہوگا۔

کشمیر اور ہم

ہماری قوم ستر برس سے زائد عرصے سے کشمیر کے معاملے پر سراپا احتجاج ہے۔ مگر کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں موجود ہے۔ اِس خاص موقع پر البتہ یہ ضرور ہوا ہے کشمیر کے معاملے میں ہماری بے بسی، ہماری عالمی تنہائی اور اقوام عالم میں ہماری بے وقعتی بالکل واضح ہو چکی ہے۔

یہ کس چیز کی سزا ہے، آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ آج کے دن ہمارے جاننے والے ایک ڈاکٹر کو اس کے کلینک کے باہر دن دہاڑے لوٹ مار کرتے ہوئے قتل کر دیا گیا۔ ایسے ڈاکو اور قاتل نہ پہلے پکڑیں گئے ہیں نہ آئندہ پکڑے جائیں گے۔ اور کبھی پکڑے جائیں تو عدالتوں میں برسوں تک مجرموں کو سزا نہیں ملتی۔

پچھلے دنوں ہمارے ایک قریبی دوست کے گھر میں رات گئے آٹھ دس افراد گھسے اور پورے گھر کا سامان لوٹ کر لے گئے۔ دوست کا قیاس ہے کہ یہ انھی پولیس والوں کی ''برکت'' ہے جو پچھلے کئی دن سے ان کی گلی میں ناکہ لگا کر کھڑے تھے۔ اب تیسرا واقعہ سنیے۔ ایک عزیز نے ایک وڈیو بھیجی۔ ایک خاتون کسی اے ٹی ایم پر پیسے نکلوانے گئی۔ ایک درندہ صفت انسان ان کے پیچھے اندر گھسا۔ اے ٹی ایم کا دروازہ بند کیا اور خاتون کے ساتھ زیادتی کی۔

یہ کوئی استثنائی واقعات ہوتے تو شاید ان کا ذکر بے محل ہوتا۔ کراچی شہر کی حد تک پہلے دو واقعات تو معمول ہیں۔ تیسری قسم کے واقعات عام طور پر ہمارے ہاں رپورٹ ہی نہیں ہوتے۔ چنانچہ جو کچھ ظلم کشمیر میں ہو رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ ہمارے اپنے ملک میں معمول کی بات ہے۔ مگر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کوئی حرکت میں نہیں آتا۔

جبکہ یہ وہ مقام ہے جہاں پر کسی جنگ اور مزاحمت کے بغیر صرف حکومت کا عزم اور انتظامیہ کا اخلاص صورتحال کو چند مہینوں میں مکمل طور پر بدل سکتا ہے۔ مگر پاکستان میں ہونے والا یہ ظلم و

ستم ہماری نااہل سیاسی قیادت، بدعنوان انتظامیہ، بے حس نظام عدل اور جذبات کی اسیر عوام کو بہت سوٹ کرتا ہے۔ اس سے زیادہ ظلم ہماری اس فکری قیادت نے ڈھایا ہے جس نے ہمیں ہمیشہ ملک سے باہر ہونے والے ظلم و ستم کے نام پر بے وقوف بنایا۔ ظاہر ہے کہ وہاں قومی حیثیت میں ہم نہ پہلے کبھی کچھ کرنے کے قابل تھے اور نہ آج ہی کچھ کرنے کے قابل ہیں۔ ہاں کچھ لوگوں کو چندے ضرور مل جاتے ہیں۔ شہرت ضرور مل جاتی ہے۔

ہم برسہا برس سے یہی منافقانہ روش اختیار کیے ہوئے ہیں کہ ہمارے دائرہ اختیار میں جان، مال اور آبرو کا ہر ظلم ہو رہا ہے، مگر ہم اس کو ختم کرنے کی کوئی سنجیدہ جدو جہد نہیں کرتے۔ البتہ جہاں ہم کچھ نہیں کر سکتے وہاں ہم خوب شور مچاتے ہیں۔ ہمارے مظلوم بھی اس ظلم کو اپنا مقدر سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔ مگر خدا کے عرش تک ایسے خاموش لوگوں کی سسکیاں ضرور پہنچتی ہیں۔ جواب میں خدائی میزان عدل میں ایسی منافق قوم پر ذلت اور رسوائی کی سزا مسلط کر دی جاتی ہے۔

آج ہم اسی دو عملی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہم اسی منافقت کا نتیجہ دیکھ رہیں۔ یہ منافقت اب ہمارے رگ و پے میں سرائیت کر گئی ہے۔ ہمیں اپنی کوئی خرابی اب خرابی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم صرف دوسرے کی خرابی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم صرف وہاں احتجاج کرتے ہیں جہاں ہم عملی طور پر کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ ہم وہاں کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھاتے جہاں سب کچھ کرنا ہمارے اختیار میں ہے۔

خدا کی سنت یہ رہی ہے کہ پہلے مرحلے پر ایسی منافق قوموں کو ذلت و رسوائی کی سزا دی جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ اصلاح کرنے والے اٹھا کر ان کو ایک آخری وارننگ دی جاتی ہے۔ اگر یہ وارننگ بھی نظر انداز کر دی جائے تو پھر وہ فیصلہ کن سزا نازل ہوتی ہے جو بہت خوفناک ہوتی ہے۔ ہمیں اُس وقت کے آنے سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے۔

موجودہ ملکی حالات کا خوش کن پہلو

پاکستان کے موجودہ حالات میں بہت سے دردمند لوگ انتہائی مایوس ہیں۔تاہم ان حالات میں ایک ایسی خیر پوشیدہ ہے جس میں کم ازکم دین کا درد رکھنے والوں کے لیے خوشی کا کافی سامان ہے۔

ہماری قوم پچھلی کئی دہائیوں سے مذہبی بنیادوں پر تقسیم کا شکار تھی۔ابتدا میں یہ تقسیم فرقہ وارانہ تھی جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ سنی تقسیم نمایاں تھی۔کمیونزم کے خلاف جنگ میں مغربی طاقتوں نے افغانستان کا محاذ کھولا تو مذہب کو اس جنگ میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔جس کے بعد سے اس مذہبی تقسیم میں انتہا پسندی، تشدد اور دہشت کا عنصر بتدریج بڑھتا چلا گیا۔پچھلی دو دہائیوں نے اس مذہبی تقسیم کا عروج دیکھا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ دین اسلام کی بدنامی، عام لوگوں کی مذہب سے دوری اور الحاد کے فروغ کا سبب بن رہا تھا۔

پچھلے چند برسوں میں بتدریج یہ تقسیم مذہب کے بجائے سیاسی بنیادوں پر استوار ہوتی چلی گئی اور اب ہم اس تقسیم کا عروج دیکھ رہے ہیں۔یہ سیاسی تقسیم اور سیاسی انتہا پسندی اپنی جگہ گرچہ ایک بڑا مسئلہ ہے، مگر دردمند اہل مذہب کے لیے اس میں یہ خیر ہے کہ دین اسلام اس تنازع سے نکل چکا ہے۔ایسے میں یہ بھرپور موقع پیدا ہوگیا ہے کہ دین کی اصل دعوت یعنی ایمان و اخلاق کو پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

مگر اس عظیم موقع کو دین کے حق میں استعمال کرنے کے بجائے اگر دردمند لوگ خود کو اس نئی سیاسی جنگ کا حصہ بنا کر کسی ایک یا دوسرے فریق کے حمایتی کے طور پر سامنے آتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خدا کے پیدا کردہ اس موقع کو نہیں پہچانا۔ایسے لوگوں کو اپنی غلطی کی اصلاح کر کے اپنی صلاحیت کو صحیح میدان یعنی ایمانی اور اخلاقی تربیت میں لگانا چاہیے کہ یہیں سے سیاسی اور دیگر میدانوں میں اصلاح کا راستہ کھلے گا۔

پوسٹ ٹرتھ اور ایمان کا امتحان

آج کل پوسٹ ٹرتھ (Post Truth) کا عالمی سیاست میں بہت شور ہے۔ اس اصطلاح کا مطلب یہ ہے کہ حقائق کے جواب میں جذباتی باتیں کی جائیں، اچھی پالیسی کے بجائے فرد کی شخصیت کو سامنے لایا جائے، اپنے مثبت کام کے بجائے کسی فرد یا گروہ کو ولن بنا کر لوگوں کے منفی جذبات کو اپیل کیا جائے۔ پوسٹ ٹرتھ کا طریقہ جمہوریت کے دور میں بہت موثر ثابت ہو رہا ہے۔ پچھلے برسوں میں دنیا بھر میں کئی ممالک مثلاً بھارت، امریکہ وغیرہ میں اسی پوسٹ ٹرتھ کے ذریعے نئے سیاست دان اور پارٹیاں اقتدار میں آئی ہیں۔ مگر تاریخ یہ بتاتی ہے کہ آخر کار اس طرح کا راستہ اختیار کرنے والی قومیں بربادی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

پوسٹ ٹرتھ اسی سائنٹفک پروپیگنڈا کی ایک نئی شکل ہے جس کی بنیاد پچھلی صدی میں جوزف گوئبلر نے نازی جرمنی میں رکھی تھی اور پوری قوم کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ مگر آخر کار یہ جرمنی کی مکمل تباہی پر ختم ہوا۔ اسی طرح سوویت یونین میں کمیونسٹ حکومت نے عرصے تک ایک آہنی پردہ تان کر دنیا کو حقائق سے بے خبر رکھا اور یکطرفہ پروپیگنڈا کے زور پر سوویت یونین کو جنت ارضی ثابت کرتے رہے۔ مگر جب سووت یونین بکھرا اور یہ پردہ گرا تو معلوم ہوا کہ اس جنت ارضی میں لوگوں کے پاس کھانے کو روٹی بھی نہ تھی۔ چنانچہ آج بھی جو قومیں پوسٹ ٹرتھ کے جذباتی پروپیگنڈے کی بنیاد پر لیڈروں کا انتخاب کر رہی ہیں، وہ اپنی تباہی کو دعوت دے رہی ہیں۔

سطحی پروپیگنڈے کی یہ تباہی دنیا کی بربادی تک ہی محدود نہیں بلکہ آخرت کی تباہی بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سچائی خدائے واحد کی ہستی ہے۔ انفس و آفاق میں ہزاروں نشانیاں غور کرنے والوں کو اس رب رحیم کا پتہ دیتی ہیں۔ مگر ماضی میں شرک اور اب الحاد کا شکار لوگ اسی طرح کی سطحی باتیں کر کے انسانیت کو خدائے واحد سے پھیرتے رہے۔

مثلاً شرک کے حق میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ جس طرح بادشاہوں کے کچھ مقرب ہوتے ہیں، خدا کے بھی کچھ مقرب ہیں جن کو راضی کر کے خدا کو راضی کیا جا سکتا ہے۔ یا جس طرح انسانوں کی اولاد ہوتی ہے اسی طرح معاذ اللہ خدا کی بھی اولاد ہے اور انسانوں کی طرح خدا بھی اپنی اولاد کا کہا نہیں ٹال سکتا۔ یہ سطحی اور کھوکھلی باتیں عام لوگوں کو بڑی اپیل کرتی تھیں۔ کیونکہ وہ خود اسی بادشاہی نظام اور آل و اولاد کی دنیا میں رہتے تھے۔ لیکن حقیقت وہی ہے جسے انبیا نے پوری قوت سے واضح کیا کہ خدا کی ہستی معبودِ واحد ہے۔ وہی رحیم و کریم ہے جسے اپنی محبت کے اظہار کے لیے کسی شفاعت کرنے والے بیٹے یا مقرب کی ضرورت نہیں۔ اس کی رحمت اور علم ہی ان لوگوں کے لیے کافی ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اسی طرح الحاد میں یہ جھوٹ مسلسل بولا جاتا ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے خود بخود یا اتفاق سے ہو رہا ہے۔ حالانکہ یہ پوری کائنات جتنی پیچیدہ مگر منظّم، متضاد مگر مفید، بے شعور مگر بامعنی عوامل پر مشتمل ہے وہ گواہی دیتے ہیں کہ اس کائنات کا ایک رب ہے اور الحاد کی باتیں کذب و بہتان ہیں۔ مگر پھر بھی پروپیگنڈے کے زور پر لوگ اس جھوٹ پر یقین رکھتے ہیں کہ یہاں کوئی خدا نہیں اور سب کچھ خود بخود ہوتا ہے۔

مگر یہ رویہ چاہے دینی پہلو سے ہو یا دنیوی پہلو سے، یہ انسانی عقل کی توہین ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسان عمل سے پہلے فکر کے امتحان میں ڈالا گیا ہے جسے ایمان کہا جاتا ہے۔ ایمان اپنی حقیقت کے اعتبار سے سچائی کو ہر طرح کے تعصّبات، جذبات اور خواہشات سے اوپر اٹھ کر ماننے کا نام ہے۔ انسان پر لازم ہے کہ وہ شرک والحاد سے اٹھ کر خدائے واحد کو مانے۔ اسی طرح انسان پر لازم ہے کہ وہ پوسٹ ٹرتھ اور ہر طرح کے پروپیگنڈے سے اوپر اٹھ کر حق اور سچ کا ساتھ دے۔ انسان کی نجات اسی میں ہے۔ چاہے دنیا میں ہو یا آخرت میں ہو۔

سیدنا حسین کی سیرت کا سبق

سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت پر جب بھی بات ہوتی ہے تو اکثر آپ کی شخصیت اور سیرت کا اصل سبق عقیدت اور سیاست کی گرد میں چھپ جاتا ہے۔ ایسے میں دین اور تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت میں یہ خاکسار اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے کہ سیدنا حسین کی زندگی جو اس طرح کے حالات میں ایک بندہ مومن کی زندگی کا بہترین نمونہ ہے، اسے سامنے لایا جائے۔ راقم کے نزدیک اس تحریر کی اہمیت یوں بھی ہے کہ بعض اہل علم سیدنا حسین کے اقدامات پر اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں سوالات اٹھاتے ہیں۔ جذباتیت اور عقیدت سے قطع نظر یہ سوالات بنیادی نوعیت کے ہیں۔ اس تحریر میں انھی سوالات کے بالواسطہ جواب بھی دیے گئے ہیں۔

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اقدام کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب حضرت امیر معاویہ نے یزید کی ولی عہدی کا اعلان کیا اور اپنی زندگی ہی میں سلطنت کے تمام عاملین اور امت کے تمام اکابرین سے اس کی بیعت لینے کا عمل شروع کر دیا۔ اس وقت چار نمایاں لوگوں نے اس بیعت سے انکار کر دیا یعنی حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبداللہ ابن عمر اور حضرت حسین۔ ان میں سے حضرت حسین کا قد و قامت ہر پہلو سے سب سے بڑا تھا۔ آپ نواسہ رسول ہی نہیں بلکہ حضرت علی کے بیٹے اور حضرت حسن کے بھائی تھے۔ اس پہلو سے جو عوامی عصبیت آپ کو حاصل تھی وہ کسی اور کو حاصل نہ تھی۔

حضرت امیر معاویہ کے پاس اگر یزید کی بیعت کرانے کی سیاسی وجوہات تھیں تو ان حضرات کے پاس بیعت نہ کرنے کی دینی اور اخلاقی وجوہات تھیں۔ جن کو انھوں نے بہت واضح انداز میں حضرت امیر معاویہ کے سامنے اس وقت رکھ دیا تھا جب وہ ان سے بیعت کرانے کے لیے سن 51 ھجری میں حج کے موقع پر مکہ میں ملے تھے۔ حضرت معاویہ اس کے بعد بھی نو برس زندہ رہے لیکن ان حضرات سے بیعت کے لیے اصرار نہیں کیا۔ اسی طرح ان حضرات کی طرف سے

بھی کسی قسم کا اقدام نہیں کیا گیا۔

یہ وہ پہلا سبق ہے جو ہمارے سامنے آتا ہے۔ایک چیز اگر اخلاقی بنیادوں پر غلط ہو تو چاہے وہ سلطنت کی طاقت کے ساتھ ہو، اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیے۔لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بغاوت کر دی جائے، اس لیے کہ بغاوت یا خروج سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ منع کیا تھا۔اس معاملے میں قرآن وحدیث کی ہدایات اتنی زیادہ واضح ہیں کہ ممکن ہی نہیں کہ ایسی جلیل القدر شخصیات ان کے خلاف جا کر کوئی قدم اٹھا سکیں۔

یہیں سے یہ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حضرت امیر معاویہ کی وفات کے بعد اور یزید کے خلیفہ بننے کے بعد وہ قدم کیوں اٹھایا جس کے نتیجے میں کربلا کا سانحہ رونما ہوا۔اس کا جواب یہ ہے کہ یزید کے خلافت سنبھالنے کے بعد اس کا اقتدار پوری سلطنت میں قائم ہی نہیں ہو سکا تھا۔ چنانچہ مکہ میں عبداللہ ابن زبیر کی بیعت ہوگئی تھی۔اسی طرح عراق کے لوگ بھی یزید کی بیعت پر آمادہ نہ تھے۔ان کے عزم اطاعت اور دعوت بیعت پر مبنی مسلسل خطوط اور پھر مسلم بن عقیل کی طرف سے یقین دہانی کے بعد جن کو حضرت حسین نے اہل عراق کے احوال کی تصدیق کے لیے کوفہ بھیجا تھا، حضرت حسین کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ عراق میں بھی یزید کا اقتدار قائم نہیں ہوا ہے۔

چنانچہ حضرت حسین نے کسی قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت نہیں کی تھی بلکہ یزید کا اقتدار ابھی قائم ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ حضرت امیر معاویہ کے اس فیصلے کو درست نہیں سمجھتے تھے جس میں انھوں نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنا دیا تھا، مگر ایک قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنا اسلامی اصولوں کے خلاف تھا۔ چنانچہ وہ خاموش رہے۔لیکن حضرت امیر معاویہ کے بعد سیدنا حسین کا اہل عراق کی دعوت پر وہاں بیعت کے لیے جانا قائم شدہ حکومت کے خلاف اقدام کے زمرے میں نہیں آتا تھا۔مگر بدقسمتی سے یہ اہل عراق دھوکے باز تھے۔ چنانچہ انھی بزدلوں نے آپ کو عراق بلا کر آپ سے غداری کر دی اور کربلا کے میدان میں آپ ہی کے خلاف صف آرا

ہو گئے۔ جب یہ بات آپ پر واضح ہوگئی کہ یزید کا اقتدار عراق پر بھی مکمل طور پر قائم ہو چکا ہے تو آپ نے وہ تین شرائط میدان کربلا میں عمر بن سعد کے سامنے رکھیں تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مجھے یزید کے پاس جانے دو، میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دوں گا۔سوال یہ ہے کہ وہ اگر یزید کے اقتدار کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے تو اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ کیا صرف اس لیے دینے کو تیار ہو گئے تھے کہ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ان کی اعلیٰ شخصیت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات نا قابل فہم ہے۔ ہمارے نزدیک اصل بات وہی ہے کہ پہلے یزید کا اقتدار قائم نہیں ہوا تھا، مگر جب آپ پر واضح ہوگیا کہ یزید کا اقتدار مکمل طور پر قائم ہو چکا ہے تو آپ نے دینی تعلیمات کے عین مطابق وہی فیصلہ کیا جو آپ کو کرنا چاہیے تھا۔

بدقسمتی سے کوفہ کے بدعہد لوگوں نے یہ موقع آنے ہی نہیں دیا۔ان کو اندازہ تھا کہ یزید حضرت حسین کو کچھ نہیں کہے گا، مگر جب ان کے بارے میں حضرت حسین یزید کو بتائیں گے کہ انھوں نے آپ کو بلایا تھا تو اس نے ان بدعہدوں کو نہیں چھوڑنا۔ چنانچہ اپنی جان بچانے کے لیے انھوں نے آپ کو اور آپ کے خاندان والوں کو شہید کر دیا۔چنانچہ تاریخی روایات یہی بتاتی ہیں کہ عبیداللہ ابن زیاد اس شرط کو ماننے کے لیے تیار ہوگیا تھا مگر شمر بن ذی الجوشن نے اس کو ورغلاتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ وہ آپ کو اپنے سامنے ہتھیار ڈلوائے ۔عرب کے سب سے بڑے سردار کے لیے یہ انتہائی توہین آمیز شرط تھی جس کا پورا کرنا ممکن نہ تھا۔جس کے بعد مفسدوں کو اپنا کام کرنے کا موقع مل گیا۔

چنانچہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ حضرت حسین کا کوئی قدم نہ دین کی تعلیم کے خلاف تھا اور نہ سیاسی مفادات کے حصول کے لیے تھا۔جس وقت جو رویہ دینی اور اخلاقی پہلو سے آپ جیسی شخصیت سے مطلوب تھا، آپ نے اسی کا مظاہرہ کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ جذباتیت، عقیدت اور سیاست کی گرد میں اب لوگ کسی حقیقت کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔

مولانا وحید الدین خان

کام یا نام

مولانا شبلی نعمانی سے کسی نے پوچھا کہ بڑا آدمی بننے کا آسان نسخہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کسی بڑے آدمی کے اوپر کیچڑ اچھالنا شروع کردو۔

اصل یہ ہے کہ کام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کام وہ ہے جو معروف میدانوں میں ہوتا ہے، دوسرا وہ جو غیر معروف میدان میں کیا جاتا ہے۔ معروف میدان میں زور دکھانے والا آدمی فوراً لوگوں کی نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے برعکس غیر معروف میدان میں محنت سے آدمی کو نہ شہرت ملتی ہے اور نہ مقبولیت۔ جس چیز کا عوام میں چرچا ہو اس کے ساتھ اپنے کو ملانے میں آپ کا چرچا بھی بڑھے گا اور جس چیز کا عوام میں چرچا نہ ہو اس کے ساتھ لگنے میں آپ بھی چرچے سے محروم رہیں گے۔

اگر آپ کسی مسلمہ شخصیت کے خلاف بولنے لگیں۔ کسی مشہور معاملہ کو اپنا نشانہ بنائیں، کسی حکومت سے ٹکراؤ شروع کردیں۔ کوئی عالمی عنوان لے کر جلسہ جلوس کی دھوم مچائیں تو فوراً آپ اخباروں کے صفحہ اول میں چھپنے لگیں گے۔ لوگوں کے درمیان آپ پر تبصرے شروع ہوجائیں گے۔ آپ بہت سے لوگوں کے خیالات کا مرجع بن جائیں گے۔ آپ جلسہ کا اعلان کریں گے تو بھیڑ کی بھیڑ وہاں جمع ہوجائے گی۔ آپ چندے کا مطالبہ کریں گے تو لوگ آپ کو روپیہ میں تول دیں گے۔

لیکن اگر آپ خاموش تعمیری کاموں میں اپنے آپ کو لگائیں، ''گنبد'' کے بجائے ''بنیاد'' سے اپنے کام کا آغاز کریں۔ انقلابی پوسٹر چھاپنے کے بجائے خاموش جدوجہد کو اپنا شعار بنائیں۔ ملت کا جھنڈا بلند کرنے کے بجائے فرد کی اصلاح پر محنت کریں۔ سیاسی ہنگامہ چھیڑنے

کے بجائے غیر سیاسی میدان میں اپنے آپ کو مشغول کریں، تو حیرت انگیز طور پر آپ دیکھیں گے کہ آپ کے گرد نہ ساتھیوں کی بھیڑ ہے اور نہ چندہ دینے والوں کی قطاریں۔ آپ کا نام نہ اخباروں کی سرخیوں میں جگہ پا رہا ہے اور نہ پر رونق جلسوں کے ڈائس کی زینت بن رہا ہے۔

مگر یہی دوسرا کام' کام' ہے اسی کے ذریعہ کسی حقیقی نتیجے کی امید کی جا سکتی ہے۔ اس کے برعکس پہلا کام ' کام' کے نام پر استحصال ہے۔ اس سے شخصی قیادتیں تو ضرور چمکتی ہیں مگر قوم اور ملت کو اس سے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ ایک اگر کام ہے تو دوسرا صرف نام۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عز وجل نے فرمایا میں اپنے بندے کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہوں جس کا وہ میرے ساتھ گمان کرتا ہے اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اللہ کی قسم اللہ اپنے بندے کی توبہ پر اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا تم میں سے کوئی اپنی گمشدہ سواری کو جنگل میں پا لینے سے خوش ہوتا ہے۔ اور جو ایک بالشت میرے قریب ہوتا ہے میں ایک ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور جو ایک ہاتھ میرے قریب ہوتا ہے میں دو ہاتھ اس کے قریب ہوتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میری رحمت اس کی طرف دوڑ کر آتی ہے۔ (صحیح مسلم: جلد سوم: حدیث نمبر 2455)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر آدمی خطا کار ہے اور خطا کاروں میں وہ بہت اچھے ہیں جو (خطا وقصور کے بعد) مخلصانہ توبہ کریں اور اللہ کی طرف رجوع ہو جائیں۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

مولانا سید متین احمد شاہ

سورہ اعراف کا ایک قصہ

قرآن مجید میں کئی قصے بیان ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک اہم قصہ وہ ہے جو سورۂ اعراف میں بیان ہوا ہے۔اس قصے اور اس سے حاصل ہونے والے دُرُوس و عِبَر کو بیان کیا جاتا ہے۔ اللہ لکھنے میں اخلاص وقبول عطا فرمائے اور راقم وقارئین کے لیے عمل اور اپنی رضا کا ذریعہ بنائے جو جینے کا مطلوب ومقصود ہے۔ آمین۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(اے رسول !) ان کو اس شخص کا واقعہ پڑھ کر سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائیں،مگر وہ ان کو بالکل ہی چھوڑ نکلا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگا،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا۔اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اسے سر بلند کرتے،مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا،اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا رہا؛اس لیے اس کی مثال اس کتے کی سی ہوگئی کہ تم اس پر حملہ کرو تب بھی وہ زبان لٹکا کر ہانپے گا اور اگر اسے (اس کے حال پر) چھوڑ دو تب بھی زبان لٹکا کر ہانپے گا۔یہ ہے مثال ان لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا ہے، لہٰذا تم یہ واقعات ان کو سناتے رہو،تاکہ یہ کچھ سوچیں۔کتنی بری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے اور جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔جسے اللہ ہدایت دے،بس وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور جسے وہ گمراہ کردے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھاتے ہیں۔‘‘،(الأعراف 7:175-178،ترجمہ مولانا محمد تقی عثمانی،آسان ترجمۂ قرآن)

عام طور پر مفسرین نے اس قصے میں اس شخص سے مراد ایک متعین فرد لیا ہے۔پھر اس متعین فرد کے بارے میں تین قول ہیں :ایک یہ کہ اس سے امیہ بن ابی الصّلت مراد ہے جو رسول اللہ کے عہد میں تھا اور اعلیٰ انسانی اوصاف کے ساتھ حکیمانہ کلام میں بھی ممتاز درجہ رکھتا تھا۔

اس کو جب معلوم ہوا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں میں ایک پیغمبر کے آنے کی پیشین گوئیاں موجود ہیں تو اس کا گمان ہوا کہ شاید وہ پیغمبر میں ہی ہوں۔ بعد میں جب اسے رسول اللہ کے دعوائے نبوت کی خبر ملی اور اس نے آپ کا کلام سنا تو اس کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ پیغمبرِ اسلام کا مخالف بن گیا۔ (مولانا وحیدالدین خان، تذکیرالقرآن، ص422)۔

دوسرا قول زیادہ مفسرین نے بیان فرمایا ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل کا ایک عابد وزاہد اور عالم شخص ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخر زمانہ کا فرد تھا اور عراق یا کنعان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس شخص کا تذکرہ توریت (گنتی باب 22، 23 اور 24) میں بھی تفصیل سے آیا ہے۔ (مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، تفسیرِ ماجدی، 2: 245، 246)۔

تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے صیفی ابن الراہب مراد ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، تفہیم القرآن، 2: 100)۔

اس کے علاوہ دو قول اور ہیں جن میں اس شخص سے مراد کوئی فرد نہیں، بلکہ دو جماعتیں مراد ہیں۔ ایک قول کے مطابق اس سے خود قریش مراد ہیں جو نبی کریم کے مخالف تھے۔ قدما میں یہ قول علامہ ابوحیّان اندلسی نے نقل کیا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے یہود بحیثیت قوم مراد ہیں۔ (مولانا امین احسن اصلاحیؒ، تدبرِ قرآن، 3: 396) مولانا مودودیؒ کا رجحان بھی اسے تمثیل تسلیم کرنے کی طرف ہے۔ (تفہیم القرآن، 2: 100)۔

مذکورہ بالا گفتگو کی رو سے اس شخص سے خواہ کوئی فرد مراد ہو یا جماعت، اس سے حسبِ ذیل امور ہمارے درس اور عبرت کے لیے سامنے آتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدابیر سے انسان کو کبھی بھی بے خوف نہیں ہونا چاہیے، چاہے علم اور تقویٰ کے کتنے بلند مقام پر فائز ہو۔ اللہ کے سامنے صرف اور صرف عبدیت ہی کام آتی ہے،

اس کے سامنے سرکشی اور ناز کی ادائیں بربادی کا سبب بن جاتی ہیں

ظاہری اخلاق اور علم کے باوجود عین ممکن ہے کہ انسان اللہ کے دربار میں مردود ہو؛ اس لیے مردود ہونے کے خوف سے بےخوف اور بے پروانہیں ہو جانا چاہیے، بلکہ آخری دم تک انسان کے لیے فکرمندی لازم ہے۔ عارفِ رومیؒ فرماتے ہیں: اندرایں رَہ می تراش ومی خراش۔ تادمِ آخر، دمے فارغ مباش (اس راہ کے اندر مسلسل تراش خراش میں لگے رہو اور آخری دم تک بھی چین سے نہ رہو)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے :إِنَّ الْـحَـيَّ لَا تُـؤْمَـنُ عَـلَيْـهِ الْـفِتْـنَةُ .(ابـو داود، الـزهـد، ص 140 :۔) (زندہ انسان فتنے میں پڑنے سے محفوظ نہیں ہے۔) اس کا مطلب یہ ہے کہ زندہ انسان کے احوال کس قدر اچھے کیوں نہ ہو جائیں، قضا وقدر کے احکامات کے مطابق وہ کسی وقت بھی فتنے میں پڑ سکتا ہے جس سے اس کا دین وایمان جا سکتا ہے۔ اس لیے اللہ سے ان نعمتوں کی حفاظت کے لیے پورے صدقِ دل سے دعا مانگنی چاہیے۔ اللہ کے ہاں اخلاص اور صدق کی بڑی قدر ہے۔ اللہ کے مخلص بندوں کی سوانح میں یہ بات جا بجا ملتی ہے کہ انھیں کبھی اپنے عمل پر غرور نہیں ہوا۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ کاش میں کوئی تنکا ہوتا۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ کے احوال میں یہ بے نفسی جا بجا ملتی ہے۔

جس قدر علم اللہ دے، انسان کی ذمے داری اللہ کے حقوق کے باب میں بڑھتی چلی جاتی ہے۔ زیادہ علم کے ساتھ بے عملی اور دنیا پرستی کا وبال بھی بڑا سخت ہے۔ بلعم بن باعور کا مقام کس قدر بلند تھا، لیکن اللہ کے دیے ہوئے علم سے جب دنیا پرستی کی راہ پر چل پڑا تو اسے اس طرح سے پٹخا گیا کہ اللہ نے اس کو کتے سے تشبیہ دی ہے۔ قرآن کا یہ مقام اہلِ علم کے لیے شاید سب سے زیادہ ڈرانے والا مقام ہے۔ علامہ ابنِ عبدالبرؒ حضرت حسن بصریؒ کا فرمان نقل کرتے ہیں :

’’جو شخص دنیا سے بہت زیادہ محبت کرنے لگے، آخرت کا خوف اس کے دل سے رخصت ہو جاتا ہے۔ جو شخص علم میں تو بڑھتا جائے، لیکن اس کے ساتھ دنیا کی حرص میں بھی بڑھتا چلا جائے، اس پر اللہ کا غصہ ہی بڑھتا چلا جاتا ہے اور دنیا اس سے دور ہی بھاگتی رہے گی۔‘‘ (جامع بیان العلم و فضلہ، 1: 668۔)

علمِ دین سے مقصود تقویٰ اور رضائے خداوندی کا حصول ہے۔ یہ عالی مقصود علم ہمیشہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ اگر اس علم سے مقصود ہر جائز و ناجائز طریقے سے دنیا کا مال و دولت سمیٹنا اور شہرت و حبِ جاہ ہو تو یہ علم اللہ سے دوریوں کا سبب بنتا ہے۔ (علمِ دین کی تدریس وغیرہ کے لیے وقت کے استعمال کی اجرت، علما کے ہاں بالاتفاق جائز ہے، خاص طور پر جب کہ کوئی اور پیشہ بھی نہ ہو)۔

اعمال کا مدار خاتمے پر ہے، اس لیے حسنِ خاتمہ کی دعا تمام صالحین کی دعاؤں میں ایک مرکزی دعا کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اس دعا کو اپنی دعاؤں کا حصہ بنانا ضروری ہے۔

امیہ بن ابی الصّلت باوجود علم اور اخلاقی اوصاف کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں آ کر ناکام ہوا۔ اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ معاصرانہ حسد انسان کے برباد ہونے کی نہایت خطرناک گھاٹی ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے عمل اور علم میں اچھا ہوتا ہے لیکن کسی معاصر کی خوبیوں سے وہ جل اٹھتا ہے اور اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اس طرح حسد کا یہ مرض اس کی نیکیوں کو برباد کر ڈالتا ہے۔ شیطان کو حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلے میں اسی حسد اور تکبر کے مرض نے ہلاک کیا اور علم والوں پر یہ مرض نہایت تیزی سے حملہ کرتا ہے۔ وہ کہنے کو علم والے ہوتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے بعض اوقات نہایت کٹ کھنے بن جاتے ہیں۔ یہیں سے علمائے دنیا اور علمائے آخرت کا فرق واضح ہوتا ہے۔ علمائے آخرت دوسروں کی

خوبیوں کواللہ کی دَین اور تقسیم سمجھ کرتسلیم ورضا کی راہ اختیار کرتے ہیں، جب کہ علمائے دنیا اس سے حسد میں مبتلا ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں سے خوبیاں سلب ہو جائیں اور وہ تنہا ان کے مالک ہوں۔تعریف ہوتو انھی کی ہواور نام وشہرت حاصل ہوتو انھی کو ملے۔

مذکورہ بالا غلط طرزِ عمل کوئی فرد اختیار کرے یا جماعت،اس کا انجام اسے ضرور ملے گا۔ ماضی کی اقوام میں اس انجام کی نہایت عبرت ناک مثال قومِ یہود ہے۔اللہ کی اس قوم پر بڑی عنایات تھیں،لیکن اللہ کومقصود بنانے کے بجائے دنیا کومقصود بنانے سے اس کا وہ انجام ہوا کہ قرآن نے اس کو مغضوب علیہم (جن پر اللہ کا غضب ہوا۔) کا لقب دیا۔قرآن نے بڑی تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ میں اس قوم پر فردِ جرم عائد کی ہے اور پھر بڑی تفصیل کے ساتھ اس کے جرائم کونمایاں کیا ہے۔ان تمام جرائم میں قدرِ مشترک اللہ کی عطا کے جواب میں بے وفائی کی روش اپنانا ہے۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنی رضا والی زندگی عطا فرمائے اور ان آیات میں آنے والے انفرادی اور اجتماعی کردار کی فتنہ سامانیوں سے حفاظت فرمائے۔یارب ہم تیرے در کے حقیر اور سراپا خطا انسان ہیں،اپنی رحمت کے صدقے ہم کو اپنی دائمی رضا عطا فرما اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔آمین یارب العالمین!

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی خوشی کی خبر آتی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا شکر کرتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے۔(سنن ابوداود حدیث نمبر 2774)

کنول رخ

وہ کہتے ہیں خدا نہیں ہے

آج کی ماڈرن دنیا میں لاادریت(Agnosticism) اورالحاد(Atheism) کے تصورات نے خدائے واحد کے وجود کا یا تو سرے سے ہی انکار کر دیا ہے یا اس کے ہونے پر ایک سوالیہ نشان چسپاں کر دیا ہے۔مگر کیا خدا کی ہستی اور اس کا وجود صرف علمی دلائل سے ماننے کی چیز ہے۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ہستی کا اقرار ہماری فطرت کے اندر سے ابھرتا ہے۔اس کے آثار کائنات کی ہر شے میں ملتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں خدا نہیں ہے۔ میں نے خدا کے آثار کو تتلی کے پروں سے لے کر سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی لہروں میں دیکھا۔ میں نے انھیں ہواؤں اور بادلوں میں دیکھا۔ میں نے انھیں غموں کی تاریکیوں سے لے کر خوشیوں کی رعنائیوں میں دیکھا۔اس کی رحمت میرے ساتھ تب بھی تھی۔جب میرے ساتھ دنیا کا کوئی رشتہ نہ کھڑا تھا۔وہاں دلاسہ دینے کو نہ ماں تھی، نہ باپ، نہ کوئی بہن بھائی اور نہ ہی شوہر۔مگر اس کی رحمت مجھے اپنی آغوش میں لے لینے کے لیے موجود تھی۔میرے ایک بار لبیک کہنے پر اس نے میری ساری غفلتوں کو معاف کر کے مجھ پر نعمتوں اور رحمتوں کی ایسی بارش کی کہ اب اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

وہ کہتے ہیں خدا نہیں ہے۔ہم نے اسے آنکھ سے نہیں دیکھا۔ وہ ہے یا نہیں اس کا تعین ہم کیسے کر سکتے ہیں۔اور خدا کہتا ہے کہ کوئی آنکھ اسے نہیں پا سکتی اور وہ پا لیتا ہے سب آنکھوں کو،(الانعام آیت 103)۔وہ کہتے ہیں دنیا خود بخود رواں دواں ہے اور اسے چلانے والا کوئی نہیں۔اور وہ کہتا ہے کہ کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے انھیں جدا جدا کر دیا۔اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔پھر یہ لوگ ایمان

کیوں نہیں لاتے؟ (الانبیاء آیت 30)۔ وہ اپنے جسموں کے اعضاء کو ٹھیک ٹھیک کام کرتا پاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کا کوئی بنانے والا نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا ہی اس سے واقف ہے جو عورت کے پیٹ میں ہوتا ہے اور پیٹ کے سکڑنے اور بڑھنے سے بھی (واقف ہے)۔ اور ہر چیز کا اس کے ہاں ایک اندازہ مقرر ہے، (الرعد 8:13)۔

خدا کے تصور کو اگر خارج کر دیا جائے تو انسانی زندگی کی ہر دوسری اخلاقی بنیاد بھی اپنی جگہ کھودے گی۔ خدا کے بعد بدی اور نیکی کا تصور بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جزا اور سزا کا قانون ختم ہو جاتا ہے کیونکہ خدا کے انکار سے آخرت کا انکار ہو جاتا ہے جو کہ روز جزا و سزا ہے۔ پھر نہ عملِ صالح کی طرف لے جانے والی کوئی تحریک باقی رہتی ہے اور نہ عملِ بد سے رکنے کی کوئی ترغیب باقی رہتی ہے۔ ایسے میں کچھ نہیں جس کے ذریعے انسان اور حیوان میں فرق کیا جا سکے۔ خدائے واحد پر ایمان انسان کو زندگی کے ایسے دریچوں سے واقف کراتا ہے کہ جن کے کھلنے سے انسان کو نہ صرف اپنی ذات کی معرفت حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ خدا کا قرب حاصل کر کے اسرار کائنات بھی پا لیتا ہے۔ سب سے اہم یہ کہ انسان اپنے نفس کی نفی کر کے خدا کی ہستی کو پا لیتا ہے۔ اسی کو اقبال نے 'خودی' کا نام دیا ہے۔

خدا مادی دنیا میں تو نہیں دیکھا جا سکتا لیکن اس کو دل کی آنکھوں سے دیکھو گے تو ظاہر کی آنکھ بھی اسے دیکھ لے گی۔ وہ رنگوں میں بھی نظر آئے گا اور بے رنگی میں بھی۔ وہ راحت میں بھی نظر آئے گا اور رنج میں بھی۔ وہ تب تب نظر آئے گا، جب کوئی بھی نہ ہوگا۔ اسے یہیں دیکھ لو تو بہتر ہے، ورنہ طوعاً و کرہاً اس کو دیکھنا ہی ہوگا، مگر اس دن پچھتاووں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

ارسلان بھٹی

عورت کی مسکراہٹ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو مرد و عورت میں تقسیم کر کے پیدا کیا ہے۔ مرد مضبوط بنائے گئے ہیں کہ زندگی کی گاڑی کو اپنے خون پسینے سے کھینچ سکیں۔ مگر زندگی کی ساری خوبصورتی اللہ تعالیٰ نے ان رشتوں میں رکھی ہے جو عورتیں تشکیل دیتی ہیں۔ ان کا وجود اور ان کی ہنسی ہر گھر میں زندگی اور خوشی کی علامت ہے۔

ایک گھر میں جب ایک بیٹی کسی بات پر کھلکھلا کر دل سے ہنستی ہے تو اس کی ماں، باپ، بہنیں اور بھائی اتنی خوشی محسوس کرتے ہیں کہ ان کی خوشی کو الفاظ بیان کرنے سے قاصر ہیں۔

ایک گھر میں جب ایک ماں کسی بات پر کھلکھلا کر دل سے ہنستی ہے تو اس کی اولاد کو ایسے لگتا ہے کہ جیسے پوری کائنات کی خوشیاں ان کی جھولی میں ڈال دی گئی ہوں۔

ایک گھر میں جب ایک بہن کسی بات پر کھلکھلا کر دل سے ہنستی ہے تو اس کی بہنیں اور بھائی اپنے دلوں میں وہ ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں جو ان کے چہروں پر بہار لے آتی ہے۔

ایک گھر میں جب ایک بیوی کسی بات پر کھلکھلا کر دل سے ہنستی ہے تو اس کا شوہر ایسی راحت محسوس کرتا ہے کہ وہ زمانے کے تمام غم بھول جاتا ہے۔

سچی مسکراہٹوں اور قہقہوں کے ذریعے اپنے گھروں کو تباہ ہونے سے بچایئے۔ خواتین کو خوشیاں دے کر اپنے گھر میں خوشیاں لایئے۔

یاد رہے کہ یہ کھلکھلاتی مسکراہٹیں اور قہقہے دل سے ہونے چاہئیں۔ وگرنہ مصنوعی اور ذاتی مفاد کے حصول والی مسکراہٹیں پہچانی جاتی ہیں، انہیں چھپایا نہیں جا سکتا کیونکہ انسان بہت سیانی مخلوق ہے۔

ریاض علی خٹک

اپروچ کا فرق اور کامیابی

ایک گھوڑا 88 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے لیکن ایک ہی نسل کے دس گھوڑوں میں جب ریس ہوتی ہے تو کوئی ایک ہی جیتتا ہے۔ یہ وہ گھوڑا ہوتا ہے جو اپنے جسم میں سے گھوڑوں کی عام رفتار سے زائد رفتار کشید کر لے۔

ایک عام انسانی جسم جب پرسکون ہو تو یہ 100 واٹ کی پاور بنا سکتا ہے جو کہ خوراک کی 2000 کلوکیلوریز کے برابر ہے جو ہم اس سے کشید کرتے ہیں۔اس لیے عام انسانی ضرورت روزانہ کی 2000 کیلوریز سمجھی جاتی ہیں۔

ریس روڈ پر ایک ماڈل کی گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ایک گاڑی کے ڈرائیور نے نائٹروجن آکسائیڈ کا سسٹم گاڑی میں لگایا ہے۔ جب وہ بٹن دباتا ہے تو نائٹروجن اور آکسیجن اس کی گاڑی کے کمبسشن سسٹم میں داخل ہوتی ہے۔دوسری گاڑیوں کو ہوا میں دستیاب آکسیجن کی نسبت اس ڈرائیور کی گاڑی کو اچانک دوگنی آکسیجن ملتی ہے اور اس کی گاڑی بندوق سے نکلی گولی کی طرح آگے نکل جاتی ہے۔

گھوڑوں کا فرق صحت، تربیت اور سوار کا ہے۔گاڑی کا فرق ٹیکنالوجی کا ہے۔ دونوں میں جیت کا یہ فرق انسان کی کوشش سے بنا۔آپ بھی جیت کے طلبگار ہیں۔آپ نے اپنی شخصیت، اپنی ذات کی تربیت، اپنی شعوری ترقی کے لیے کیا کوشش و محنت کی......؟ دوسروں سے آپ کتنے منفرد ہیں یہ آپ کی اپروچ پر طے ہوتا ہے۔ یہ زیادہ کھا کر 2000 کیلوریز سے آگے جانے میں نہیں، نہ ہی 100 واٹ سے زیادہ انرجی بنانے میں ہے۔ یہ اپنی شخصیت کی تربیت اور مضبوط عزم ہے جو یہ فرق پیدا کرتا ہے۔

ثمر عمیر

حسد اور انسان

جس شخص نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ شعوری طور پر سمجھ لیا ہو اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کی ناراضی کی حالت میں اپنے رب کریم سے ملاقات کرے۔ اللہ کو ہر اخلاقی برائی ناپسند ہے۔ حسد کا شمار ایسی ہی اخلاقی برائی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ جاننا ضروری ہے کہ حسد کیا ہے؟ کیسے پیدا ہوتا ہے؟ اس کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟ اس کا شکار ہونے کے بجائے کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟

حسد کیا ہے؟

کسی کی نعمت پر گھٹن محسوس کرنا اور یہ خواہش کرنا کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے یا پھر عملی اقدام کر کے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا۔

قرآن میں ہمیں اس حوالے سے یہ دعا سکھائی گئی ہے جس سے ہم سب واقف ہیں۔

ومن شر حاسد اذا حسد

مفہوم ''میں پناہ میں آتا ہوں صبح کے رب کی، حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے''۔

حسد کرنے والوں کے حوالے سے قرآنی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

حسد جس کی بنیاد دراصل تکبر پر ہے، انسان کو ایسا اندھا کر دیتی ہے کہ اس کے بعد ذلت اس کے لیے یقینی ہو جاتی ہے۔ اس کی واضح مثال ابلیس کی ہے۔ اس نے تکبر کیا اور راندۂ درگاہ ہوا۔ تکبر کی سنگینی بالکل واضح ہے کہ متکبر لوگ جنت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکیں گے۔

قرآن مجید میں اس حوالے سے ہمیں آدم و ابلیس کی روداد سنائی گئی ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ابلیس کو اپنے اوپر آدم کی برتری پر نفرت اور حسد کے جذبات اس درجے پر لے گئے کہ اللہ تعالیٰ کا لحاظ بھی اسے نہیں رہا۔ یعنی جذبۂ حسد کے غلبے نے اسے یہ بھی بھلا دیا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر رہا ہے۔

حسد کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اسے اپنا

آپ زیادہ علیم وحکیم نظر آتا ہے۔ یہود کا رسول پر ایمان لانے میں تردد اس کی مثال ہے۔ یہی وہ حاسدانہ ابلیسی روش تھی جس کا وہ شکار تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں یہ بات تنبیہ فرمائی تھی کہ تمہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی ہونے کی حیثیت سے منتخب ہونا ناگوار گزر رہا ہے کیونکہ وہ تمہاری نسل سے براہ راست نہیں ہیں۔ نبوت کی اس نعمت اور فضیلت کے وہ کیسے حقدار ہو گئے؟ ان کی اس سوچ پر سرزنش کرتے ہوئے یہ بتایا گیا کہ: کیا تم اللہ تعالیٰ کے فضل کی بانٹ پر اعتراض کرو گے؟ اگر کرتے بھی ہو تو اللہ تعالیٰ کسی کی خواہشوں کے پابند نہیں ہیں۔

مرد وزن کے حوالے سے بھی یہ کہا گیا کہ مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے سے اگر مقابلہ کرنا ہے تو ایمان وتقویٰ کے میدان میں کریں اور جو ایک دوسرے پر مادی، جسمانی، علمی یا کسی بھی قسم کی ظاہری اور باطنی فضیلت حاصل ہے اس پر اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل طلب کریں۔

اسی طرح محسود (جس سے حسد کیا جا رہا ہے) کے حوالے سے یوسف علیہ السلام کی سیرت پیش کی گئی کہ صبر اور احسان کا دامن یوسف علیہ السلام کی طرح کبھی بھی نہ چھوڑیں۔ آخر کار حاسد اپنے انجام کو اس دنیا میں بھی دیکھ لے گا اور آپ کے حسن سلوک کا معترف بھی ہو گا۔

حسد کرنے والا متکبر کیوں ہے؟ کیونکہ وہ اپنے سے بہتر درجے پر کسی کو برداشت نہیں کرسکتا، اس کے پندار پر چوٹ لگتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ حق ہمیں پہنچتا ہے کہ ہم خدا کی اس صفت میں شرک کریں کیونکہ اکیلا وہ ہے اس جیسا کوئی نہیں ہے، اس سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ یہ تو صرف خدائے برتر کا ڈومین ہے۔

تکبر کرنے والا نہ پہاڑوں کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور نہ زمین چیر سکتا ہے۔ ہمارا مقام خدا کے سامنے ایسا بھی نہیں ہے جو گلہری کا پہاڑ کے آگے۔

اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ہم یہ سنتے ہیں کہ ”محنت کر حسد نہ کر“ تب بھی معاملہ ایسا ہے کہ بعض کامیابیاں اور نعمتیں محنت سے نہیں حاصل ہوتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتی ہیں لہٰذا صرف دعا کی جاسکتی ہے، اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے گہرا کرنے کی، اس کے قرب کو پانے کی۔ لیکن اس سب کی بنیاد پستی اور عاجزی ہے نہ کہ تکبر۔ انسان اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے تو دنیا میں نہ سہی آخرت میں ضرور اس کی دعا بہترین شکل میں قبول ہو سکتی ہے۔

فاطمہ ہاشم قریشی

ہم سب کو محنت کرنا ہوگی

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب آج سے کم و بیش برس قبل میں کینیڈا میں مستقل رہائش پذیر ہوئی۔ اُن دنوں یہاں ہم جنس پرستی کی حمایت اور اس عمل کو قانونی طور پر قابلِ قبول بنانے کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ چوں کہ میرا مسکن کینیڈا کا شہر مانٹریال تھا اور وہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی ہے تو میں فوری طور پر فرانسیسی زبان سیکھنے کے لیے یونیورسٹی میں داخل ہوگئی۔ اسی سلسلے میں سالانہ امتحان میں میری فرانسیسی اُستاد نے میری دوست کے مقابل مجھے مقالہ کا یہی موضوع گرما گرم مسئلے کے طور پر دیا۔ اللہ کا نام لے کر میں نے یہ چیلنج قبول کرلیا۔ امتحان میں کامیابی کا دارومدار اِسی مقالے کی کامیابی پر تھا۔

میرا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالی کی مدد کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔ انسان کا علم خواہ کتنا بھی پراثر کیوں نہ ہو، اُس مالک اور خالق کا ہی علم کامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال رہی اور میں اپنی ساتھی کو دلائل کے ساتھ قائل کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ یہ کسی صورت بھی قابلِ قبول عمل نہیں اور آنے والے وقت میں اس کے نقصانات بہر حال انسان کو بھگتنا ہی پڑیں گے۔

اور آج مجھے وہ وجہ مل گئی جس کا حوالہ اتنے برس پہلے اِس ناچیز نے اپنی دوست کو دلائل کے طور پر دیا تھا۔ آج راہ چلتے ایک دس سالہ پیاری سی بچی مجھے Happy prides day یعنی ہم جنس پرستی کا عالمی دن مبارک ہو کہہ کر چلتی بنی اور میں محو حیرت بنی یہ سوچتی رہ گئی کہ کس آسانی سے بنی نوعِ اِنسان نے خود کو اور اپنی آنے والی نسلوں کو اُس رحمان کی رحمت سے ٹھکرائے ہوئے شیطان کے ہاتھوں کھلونا بنا ڈالا ہے۔ اُس رحمان کے سمجھانے میں تو کوئی کسر نہ تھی، اُس نے تو طرح طرح سے سمجھایا۔ اپنی پسند اور ناپسند کھول کھول کر بیان کی۔ انبیاء علیھم السلام کے

ذریعے ہدایت صاف صاف پہنچادی۔ہم نے پھر بھی کان نہ دھرے،ہم پھر بھی غافل ہی رہے۔ ہم بے حیائی میں اس حد تک ڈوب گئے کہ اب ہمارے بچے بھی فخر سے اس دن کو منانے اور اس کی مبارکباد دینے کو اہمیت دینے لگے ہیں۔ پانی اب سر سے اونچا ہو چلا ہے۔ پر ابھی بھی وقت ہے کہ ہم پلٹ جائیں اور رحمان کا راستہ اپنا لیں۔اُس کی کتاب سے رہنمائی لیں، ایمان لے آئیں اُس کے کلام پر اور خسارے میں جانے والوں کے بجائے ایمان لانے والوں اور نیک عمل کر کے حق بات اور صبر کی تلقین کرنے والوں کی صف میں شامل ہو جائیں۔ہمیں محنت کرنا ہو گی۔یہی وہ راہ جس پر چل کر شیطان کا راستہ روک سکتے ہیں۔

حضرت ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ کونسا مال بہتر ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بہترین مال اللہ کو یاد کرنے والی زبان شکر کرنے والا دل اور مومن بیوی ہے جو اسے اس کے ایمان میں مدد دے۔(جامع ترمذی: جلد دوم: حدیث نمبر 1037)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک صبح کو راہ خدا میں نکلنا یا ایک شام کو نکلنا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔ (بخاری، مسلم)

حضرت ابوعبس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی بندے کے قدم راہ خدا میں چلنے سے گرد آلود ہوئے ہوں، پھر ان کو دوزخ کی آگ چھو سکے۔(بخاری)

ملک جہانگیر اقبال

حکمتِ الٰہی

کچھ دن قبل اک ڈاکیومنٹری دیکھی جس کا نام "The nova effect" تھا۔ یہ ڈاکیومنٹری ایک نہایت دلچسپ کہانی پہ مشتمل تھی، تو کہانی کچھ یوں ہے کہ ایرک نامی شخص اپنے کتے کو (کتے کا نام nova ہے) واک پہ لے کر جاتا ہے۔ دوران چہل قدمی نووا کو ایک خرگوش بھاگتا دکھائی دیتا ہے اور شومئی قسمت کہ عین اسی وقت اس شخص کی رسی پہ گرفت ڈھیلی پڑتی ہے اور یوں نووا سرپٹ خرگوش کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے۔ کچھ دیر تک ایرک نووا کا پیچھا کرتا ہے اور پھر تھک ہار کر گھر واپس لوٹ جاتا ہے۔ دوسری جانب نووا بھی بھاگتے ہوئے بہت دور نکل جاتا ہے اور یوں گھر واپسی کا رستہ بھول جاتا ہے۔

گھر پہنچ کر ایرک خود کو بہت کوستا ہے اور اس وقت کو منحوس گردانتا ہے جب اس نے رسی ڈھیلی کی۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر رسی ڈھیلی نہ ہوتی تو شاید نووا اس وقت میرے ساتھ ہوتا۔

اس واقعے کے کچھ روز بعد دروازے کی گھنٹی بجنے پہ جب ایرک دروازہ کھولتا ہے تو دروازے پہ ایک لڑکی نووا کی رسی تھامے کھڑی ہوتی ہے۔ وہ ایرک کو بتاتی ہے کہ اسے نووا بھٹکتا ہوا ملا تو اسے گھر لے گئی اور پھر پٹے میں موجود نیم ٹیگ پہ لکھے پتے کی بدولت یہاں تک پہنچ گئی۔

ایرک نووا کو واپس پا کر بہت خوش ہوتا ہے اور یوں لڑکی سے بھی اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ اب ایرک لڑکی سے اکثر ملنے لگتا ہے اور یوں ان دونوں کو اک دوجے سے محبت ہو جاتی ہے۔ پھر ایرک سوچتا ہے کہ کتنا اچھا ہوا جو اس دن رسی ہاتھ سے چھوٹی اور خدا کا شکر ہے کہ کتنا خوش قسمت وقت تھا کہ نووا اسی لڑکی کو ملا اور یوں مجھے میری محبت ملی۔

خیر شادی کی تاریخ طے پا جاتی ہے اور ایک روز جب وہ اس لڑکی سے ملنے جا رہا ہوتا ہے تو

ٹریفک لائٹ سرخ ہو جانے پہ اسے رکنا پڑ جاتا ہے۔ جونہی سبز بتی جلتی ہے ایرک گاڑی آگے بڑھا دیتا ہے پر اسی اثنا میں مخالف رخ سے ایک تیز رفتار گاڑی بے قابو ہو کر اس کی گاڑی سے ٹکرا جاتی ہے اور یوں دو تین قلا بازیاں کھاتے ہوئے اس کی گاڑی فٹ پاتھ پہ گر جاتی ہے۔ ایرک کو ہسپتال لے جایا جاتا ہے جہاں ڈاکٹر ابتدائی طبی امداد دینے کے بعد فیصلہ کرتے ہیں کہ ایرک کے دماغ کا فوری سی ٹی سکین و ایم آر آئی وغیرہ کیا جائے جبکہ سخت تکلیف کی حالت میں یہ سب سنتے ہوئے ایرک سوچ رہا ہوتا ہے کہ کتنا منحوس وقت تھا جب میں گھر سے نکلا اور اس گاڑی کو بھی اسی وقت بے قابو ہونا تھا؟ کاش میں گھر سے نکلا ہی نہ ہوتا۔

خیر ٹیسٹ کی رپورٹس آتی ہیں تو ڈاکٹر اسے بتاتے ہیں کہ ایک بری خبر یہ ہے کہ تمہارے دماغ میں گلائیوما (ٹیومر) ہے جبکہ اچھی خبر یہ ہے کہ تمہارے دماغ میں گلائیوما (ٹیومر) ہے۔ ایرک کو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ بیک وقت ایک ہی خبر اچھی اور بری کیسے ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر اسے بتاتا ہے کہ ایکسیڈنٹ سے اسے کوئی نقصان نہیں ہوا پر ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ دماغ کے ٹیسٹ کے دوران ٹیومر کا معلوم پڑ گیا جو ابھی ابتدائی سٹیج پہ تھا وگرنہ جب اس کی علامات ظاہر ہونا شروع ہوتی ہیں تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے تم بہت خوش نصیب ہو۔

یہ سن کر ایرک سوچتا ہے کہ کتنا اچھا وقت تھا جب میں گھر سے نکلا اور کتنا خوش نصیب بھی کہ عین ٹھیک وقت پہ وہ گاڑی مجھ سے ٹکرائی ورنہ مجھے اس ٹیومر کی بابت معلوم کیسے ہوتا؟

یہ ایک اچھی ڈاکیومنٹری تھی۔ پر اس ڈاکیومنٹری کے آخری میں مصنف نے جن تاثرات کا اظہار کیا اس سے اندازہ ہوا کہ اس کو لکھنے والا الجھا ہوا تھا کہ کیسے کوئی طاقت ہے جو یہ سب کر رہی ہے۔ کائنات یا قدرت کے اصول کس طرح کام کرتے ہیں؟ کیسے کوئی برا واقعہ کسی اچھے واقعے کا موجب بن جاتا ہے یا کس طرح کوئی اچھا واقعہ کسی حادثے کی وجہ بن جاتا ہے؟ ڈاکیومنٹری ختم

ہوگئی پر میری الجھن بڑھ گئی۔ ایک دو روز تو اس پہ سوچتا رہا اور پھر دیگر مصروفیات نے اس ڈاکیومنٹری سے توجہ تو ہٹادی پر دماغ میں ایک خلش ضرور پیدا ہوگئی۔

اب یہ آج صبح کا واقعہ ہے کہ فجر کے بعد بھی جب نیند کا نام ونشان نہ ملا تو لان میں جا کر بیٹھ گیا۔ میرے بڑے بھائی کو مرغیاں پالنے کا شوق ہے لہٰذا وہ صبح سویرے ہی سب مرغے مرغیوں کو کھول کر دانہ وغیرہ ڈال دیتے ہیں۔ آج انہیں میں صبح سویرے دکھائی دیا تو مجھے بھی اپنا ہاتھ بٹوانے کے لیے ساتھ شامل کرلیا۔

ہمارے گھر کے عقبی حصے میں مرغیوں اوران کے بچوں کے لیے بارہ پنجرے ترتیب سے بنے ہوئے ہیں۔ دانہ ڈالنے کے بعد ماسوائے ایک کے باقی تمام مرغیوں کو وہیں کھلا چھوڑ دیا جبکہ ایک مرغی جس کے ساتھ اس کے بچے بھی تھے اسے دوبارہ پنجرے میں بند کرنا تھا۔ بڑے بھائی نے سب سے آخر میں رکھے پنجرے میں مرغی اور چوزوں کے لیے مخصوص دانہ ڈالا اور پانی رکھا اور مجھے مرغی کو پنجرے میں بند کرنے کا کہا۔

ایک تو مجھے مرغے مرغیاں پالنے کا ذرا شوق نہیں اور پھر مجھے انہیں ہانکنا بھی نہیں آتا۔ خیر بھائی کا حکم تھا لہٰذا بجا آوری ضروری تھی۔ لہٰذا اپنے تئیں کوشش کرنے لگا پر وہ نالائق مرغی ہر بار غلط پنجرے میں جا گھستی جب اسے پنجرے سے باہر نکالتا تو چیختے چلاتے باہر آتی اور یوں پندرہ بیس منٹ کی مشقت کی بدولت مرغی اور چوزے دردر کے پنجروں کی خاک چھاننے کے بعد اپنے مخصوص پنجرے تک پہنچ ہی گئے۔ پنجرہ بند کرتے ہوئے بھائی سے مخاطب ہو کر کہا ''یار کتنی بیوقوف مرغی ہے۔ اس کی تمام خوراک وسہولیات اس پنجرے میں موجود ہیں پر یہ نالائق بار بار غلط پنجرے میں جا گھستی تھی اور نکالنے پہ ایسا شور مچاتی جیسے اس پہ نجانے کتنا ظلم کیا جارہا ہو، دل کیا کہ اسے دوسرے پنجرے میں ہی رہنے دوں۔ جب بھوک لگتی تو اسے قدر آتی۔''

بھائی صاحب اپنے چھوٹے بھائی کو صبح صبح خواری سے چڑ چڑا ہوا دیکھ کر مسکرا دیے اور کہا ''یار یہ نادان پرندہ ہے اسے اپنے بھلے برے کا نہیں معلوم پر ہمیں تو معلوم ہے نا؟ یہ بھلے چیخے چلائے پر ہمارا کام ہے کہ اسے اس جگہ رکھیں جہاں اس کے لیے آسانیاں ہوں ورنہ ہماری عقلی برتری کا کیا فائدہ؟''

بھائی تو یہ کہہ کر چلے گئے پر میری الجھن سلجھا گئے۔

نووا ایفیکیٹ میں وہ ڈاکیومنٹری لکھنے والا جس الجھن کا شکار ہوا تھا میں اسے سلجھا چکا تھا۔جس عمل کو وہ کائناتی راز اور جس کی وقوع پذیری پہ وہ حیران اور ممکنہ ردعمل پہ کنفیوژن کا شکار تھا وہ تو میرے بالکل سامنے ہی تھا۔

جسے وہ نووا ایفیکیٹ کہہ رہا تھا اسے ہم بچپن سے ہی ''اللہ کی حکمت'' کے نام سے سنتے آئے ہیں۔جس ردعمل پہ وہ کنفیوز تھا کہ کیا ری ایکشن دے اس عمل پہ اللہ ہمیں ''صبر وشکر'' کا حکم ڈیڑھ ہزار سال قبل دے چکا۔ پر یہ ڈاکیومنٹری دیکھنے کے بعد مجھے صبر وشکر کی تعریف ٹھیک طرح سے سمجھ آ گئی۔

آج سے پہلے صبر وشکر پہ بہت پریشان ہوا کرتا تھا کہ ایک شخص حالت نقصان میں صبر تو کر سکتا ہے پر شکر کیسے ممکن؟ مثلاً ایک شخص مجھے دھوکا دے گیا۔اس عمل پہ میں صبر کر سکتا ہوں پر شکر کیسے ممکن؟ مجھے لاکھوں کا نقصان ہو تو میں صبر کر سکتا ہوں پر اس پہ شکر کیسے اور کیونکر ممکن؟ کیا محض زبان سے شکر کا لفظ کہہ دینے پہ شکر کی تعریف پوری ہو گئی؟ نہیں ہرگز نہیں۔

پر آج صبر وشکر کا مطلب سمجھ آ گیا کہ ہماری ہر آزمائش ہمیں مقام شکر تک لانے کے لیے ہوتی ہے۔لہٰذا اگر ہم صبر کریں تو دوہرے سرخرو ہوں۔اب مرغی کی ہی مثال لیں کہ وہ ہر بار اپنے تئیں تو اپنے ٹھکانے پہ جاتی پر میں ڈنڈی سے ٹھونک کر اسے باہر نکال دیتا جس پہ وہ چیختی چلاتی۔

شاید اسے میں ظالم بھی لگا ہوں گا پر میں اسے وہاں لانا چاہتا تھا جہاں اس کے لیے تمام سہولیات موجود تھیں اور یقیناً جب اپنے پنجرے میں پہنچ کر اسے خوراک اور پانی ملا ہوگا تو وہ خوش ہوئی ہوگی۔

ڈاکیومنٹری میں ''ایرک'' اگر غور کرتا تو کتے کے گم ہونے کا دکھ دراصل آخر میں اس کی زندگی بچانے کے کام آیا۔ اگر کتا نہ گم ہوتا تو اسے وہ لڑکی نہ ملتی، لڑکی نہ ملتی تو وہ اس سڑک پہ نہ ہوتا، سڑک پہ نہ ہوتا تو اس کا ایکسیڈنٹ نہ ہوتا، ایکسیڈنٹ نہ ہوتا تو ٹیومر کا پتہ نہ چلتا اور یوں جس دن اس کی شادی ہورہی تھی شاید اس کا جنازہ ہورہا ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح جب اللہ پاک ہمیں کسی شے سے دور کرتا ہے تو ہم اس کی حکمت یا بقول انگریز مصنف ''نو وا ایفیکٹ'' سمجھے بنا رونا دھونا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دوران خدا ہمیں ظالم بھی لگتا ہے اور اس وقت تک ظالم لگتا رہتا ہے جب تک وہ ہمیں اس سے بہت بہتر عطا نہیں کر دیتا۔ لہٰذا خدا کی حکمت جسے آزمائش بھی کہا گیا ہے اس پہ محض صبر کا حکم دیا گیا باقی مقام شکر تک یہ حکمت ضرور لے کر جاتی ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ اگر آج آپ کامیاب اور خوش ہیں تو ذرا ماضی میں جھانکیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کامیابی و خوشی کی منزل تب ممکن ہوئی جب فلاں فلاں بظاہر قریبی لوگ آپ کو چھوڑ گئے یا کوئی مالی نقصان ہوا جس نے آپ کو مختلف طرح سے سوچنے پہ مجبور کیا اور یوں آپ کامیابی تک پہنچے۔ ٹھیک اسی طرح اگر اس وقت آپ تکلیف میں ہیں یا لگتا ہے کہ ناکام ہو چکے تو ہمت نہ ہاریں۔ صبر کریں اور اللہ کی حکمت پہ بھروسا کرتے ہوئے چلتے رہیں۔ اس آزمائش والے وقت میں ہمت نہ ہاریں کہ جلد ہی آپ مقام شکر پہ کھڑے ہوں گے، ان شاء اللہ۔

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (64)

حقوق العباد: رشتہ داروں سے حسن سلوک

حقوق العباد کے ضمن میں قریبی تعلقات کا وہ آخری دائرہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے، پڑوسیوں اور ماتحتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پڑوسیوں کے ضمن میں ان کی تین اقسام قرآن مجید نے بیان کی ہیں جبکہ ماتحتوں میں قرآن مجید لونڈی غلاموں کا ذکر کرتا ہے۔ تاہم اس میں تبعاً وہ سارے تعلق آجاتے ہیں جہاں انسان کو کوئی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ بیویوں کی حیثیت بھی خاندان کے ادارے میں شوہر کے ماتحت ہی ہے، اس لیے ان کے ساتھ حسن سلوک کو بھی ہم اسی ذیل میں بیان کریں گے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک

انسان کے تعلقات کا ایک دائرہ وہ ہے جو رشتہ داروں سے وجود میں آتا ہے۔ یہ رشتے ناتے زندگی بھر نہیں بدلتے اور ان سے تعلق ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ مگر تعلقات کی اس قربت اور مضبوطی کے باوجود انسان جب اپنا گھر بنالیتا ہے تو اس گھر میں رشتے داروں کا آنا جانا اتنا نہیں ہوتا جتنا پاس پڑوس میں رہنے والوں کا ہوتا ہے۔ جس گھر سے آپ کے گھر کی دیوار ملی ہو، جس کا دروازہ آپ کے دروازے سے متصل ہو، جس گھر کے ہر اچھے برے کی آہٹ کسی رشتہ دار سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچ رہی ہو اور جس گھر کے مکینوں کے ساتھ آپ کا صبح وشام کا سامنا ہو، ان کے اچھے برے رویے اور نیک و بد عادات کا اثر آپ پر ہونا لازمی ہے۔ بارہا ان پڑوسیوں سے زندگی بھر کا سنجوگ ہوجاتا ہے اور نہ بھی ہو تب بھی برسہا برس ان کے ساتھ زندگی

کے ایام گزرتے ہیں۔ یہ پڑوسی اگر اچھے ہیں تو زندگی بہت اچھی گزرتی ہے اور پڑوسی اگر برے ہیں تو پھر انسان کے لیے ہر وقت ایک دردِ سر کا سامان بنے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں قرآن مجید پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتا ہے۔

پڑوسیوں کی اس اہمیت کی بنا پر قرآن مجید نے نہ صرف ان کے ساتھ حسن سلوک کو موضوع بنایا ہے بلکہ ان کی تین اقسام میں زمرہ بندی کر کے ان کی اہمیت اور حقوق کو اسی ترتیب پر رکھا ہے۔ اس ترتیب میں سب سے پہلے وہ پڑوسی ہیں جو پڑوسی ہونے کے ساتھ رشتے دار بھی ہوتے ہیں۔ ایسے رشتہ داروں کو دیگر رشتہ داروں اور ایسے پڑوسیوں کو دیگر پڑوسیوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے حقوق دیگر پڑوسیوں اور رشتہ داروں سے مقدم ہوتے ہیں۔

اس ترتیب میں دوسرا نمبر ان پڑوسیوں کا ہے جو اجنبی ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہر پڑوسی رشتہ دار نہیں ہوسکتا نہ ہوتا ہے، مگر وہ پڑوسی بہرحال ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی کے چوبیس گھنٹے انھی پڑوسیوں کی معیت میں گزرتے ہیں اور وہ انسان کی ایک آواز پر اس کے گھر کے دروازے پر آ موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے۔ اس حسن سلوک میں وہ چیزیں بھی آ جائیں گی جو رشتہ داروں کے باب میں بیان ہو چکی ہیں۔ جیسے تحفے تحائف کا تبادلہ یا یہ نہ ہو سکے تو گھر میں بنی ہوئی چیزوں کو پڑوسیوں کو تحفے میں بھیجنا۔ اسی طرح رویے، طرز عمل اور گفتگو سے ان کے ساتھ اچھی طرح معاملہ کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی بھی پہلو سے پڑوسیوں کے لیے باعث آزار نہ بننا بھی اسی حسن سلوک کا ایک حصہ ہے۔ جیسے ان کے گھر کے باہر اپنا کوڑا نہ پھینکنا، ان کا راستہ بند نہ کرنا، شور وغل سے ان کے آرام میں خلل نہ ڈالنا یا ان کی پرائیویسی میں دخل اندازی نہ کرنا وغیرہ۔

پڑوسیوں کی تیسری قسم وہ ہے جو آپ کے گھر کے ساتھ مستقل تو نہیں رہتے مگر کسی نہ کسی پہلو سے انسان کی قربت اور ہم نشینی اختیار کرتے ہیں۔ دفتر میں ساتھ کام کرنے والے، رفیق سفر،

کاروبار، تجارت یا حصول تعلیم میں شریک کار لوگ سب اس زمرے میں شامل ہیں۔ کسی مشترکہ مفاد یا ضرورت کی بنا پر یہ لوگ بعض اوقات اتنے قریب آجاتے ہیں کہ رشتہ دار اور پڑوسیوں سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ نہ بھی ہو تو وقت کی کسی خاص مدت میں ان کی قربت کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہوتی ہے اور ان کے اچھے برے سلوک کا انسان پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے اس گروہ کو بھی خاص طور پر موضوع بنا کر انھیں اس فہرست میں شامل کیا ہے جن کے ساتھ حسن سلوک کرنا بنیادی دینی تقاضا ہے۔

ماتحتوں کے ساتھ حسن سلوک

قرآن مجید نے ماتحتوں کے ضمن میں ان لونڈی غلاموں کا ذکر کیا جن کی زندگی زمانہ قدیم میں مکمل طور پر اپنے مالکوں کے رحم و کرم پر ہوتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کے ساتھ حسن سلوک کو ایک دینی مطالبہ قرار دیا ہے۔ تاہم غلامی کے ادارے کو برقرار رکھنا قرآن مجید کے پیش نظر نہ تھا بلکہ یہ زمانے کا وہ جبر تھا جو دین اسلام کو ورثے میں ملا تھا۔ دین نے غلاموں کی حالت کو بہتر بنانے کے لیے بہت سے اقدامات کیے اور ایک آخری چیز اس ضمن میں یہ بیان کی کہ جو لونڈی یا غلام اپنے مالک سے آزادی حاصل کرنا چاہتا ہو وہ مکاتبت کے ذریعے سے اپنے مالک سے اپنی ایک قیمت طے کر لے جسے ادا کرنے کے بعد اسے آزادی حاصل ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ غلاموں کو آزاد کرانا جو ان کے ساتھ کی گئی سب سے بڑی بھلائی تھی، اس پر بھی قرآن مجید میں بار بار لوگوں کو ابھارا گیا اور اسے ایک بڑی نیکی قرار دیا گیا۔

دور جدید میں جب غلامی کا یہ ادارہ ختم ہو گیا ہے تب بھی حسن سلوک کا یہ حکم اسی طرح باقی ہے اور اب اس کا مصداق وہ ملازمین، ماتحت اور زیر دست لوگ ہیں جو کچھ پیسوں کے عوض اپنی خدمات ہمیں پیش کر دیتے ہیں۔ دفتر، دکان اور کارخانے کے ملازمین، ذاتی خدام اور گھریلو کاموں کے لیے رکھے گئے ملازمین سب اس میں شامل ہیں۔ چنانچہ یہ ضروری ہے کہ ان کے

ساتھ حسن سلوک، رحم اور درگزر کا معاملہ کیا جائے۔ ان پر احسان کیا جائے اور زبان اور رویے سے ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اور ان سب امور کے ساتھ ان کی عزت نفس کو پامال کرنے سے پرہیز کیا جائے۔

قرآن مجید نے خاندان کے ادارے میں شوہروں کو گھر کا سربراہ بنایا ہے اور بیویوں کو ان سے موافقت کرنے اور ان کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ ایسے میں اس نے مردوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ دستور کے مطابق بھلے طریقے سے ان کے ساتھ معاملہ کریں۔ وہ اگر اپنی کسی عادت کی وجہ سے ناپسند بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ ایسے ہی معاملہ کریں جیسے ان کے ذریعے سے انھیں بہت خیر مل رہا ہو۔ قرآن مجید نے اس بات کو بیان کیا ہے کہ اصلاً تو یہ تعلق وہ ہے جس میں خدا کی طرف سے محبت اور رحمت رکھ دی گئی ہے۔ چنانچہ میاں بیوی کے اس تعلق کا تو ذکر ہی کیا جس میں دونوں محبت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوں، قرآن مجید کا مطالبہ تو یہ ہے کہ اگر انسان ناپسندیدگی کے عالم میں بیوی کو چھوڑ رہا ہو تب بھی احسان کا رویہ اختیار کرے اور اس فضیلت کو نہ بھولے جو اللہ نے اسے عطا کی ہے۔ وہ عورت کو اپنی طرف سے کچھ دے دلا کر رخصت کرے اور یہ اس عورت پر کوئی احسان نہیں بلکہ یہ محسنین پر اللہ کا حق ہے۔

قرآنی بیانات

''اور تم سب اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھیراؤ، والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور رشتہ دار پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور ہم نشینوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اِسی طرح مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ جو تمھارے قبضے میں ہوں۔ اللہ اُن لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اتراتے اور اپنی بڑائی پر فخر کرتے ہیں۔''، (النساء4 :36)

''اور تمھارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت چاہیں، اُن سے مکاتبت کر لو، اگر تم اُن میں بہتری پاؤ (تاکہ وہ بھی پاکیزگی میں آگے بڑھیں)۔ اور (اِس کے لیے اگر ضرورت ہو تو مسلمانو)،

اُنھیں اُس مال میں سے دو جو اللہ نے تمھیں عطا فرمایا ہے۔‘‘، (النور 24:33)

’’(نیکی کی بلند چڑھائی کیا ہے؟) یہی کہ گردن چھڑائی جائے‘‘، (البلد 90:13)

’’اور اگر تم عورتوں کو اِس صورت میں طلاق دو کہ تم نے اُنھیں ہاتھ نہیں لگایا یا اُن کا مہر مقرر نہیں کیا تو مہر کے معاملے میں تم پر کچھ گناہ نہیں ہے، مگر یہ تو لازماً ہونا چاہیے کہ دستور کے مطابق اُنھیں کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کرو، اچھی حالت والے اپنی حالت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق۔ یہ حق ہے اُن پر جو احسان کا رویہ اختیار کرنے والے ہوں۔‘‘، (البقرہ 2 :236)

’’لیکن تم نے اگر طلاق تو اُنھیں ہاتھ لگانے سے پہلے دی، مگر اُن کا مہر مقرر کر چکے ہو تو مقررہ مہر کا نصف اُنھیں دینا ہوگا، الّا یہ کہ وہ اپنا حق چھوڑ دیں یا وہ چھوڑ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے کہ تم مرد اپنا حق چھوڑ دو اور اپنے درمیان کی فضیلت نہ بھولو۔ بے شک اللہ دیکھ رہا ہے اُس کو جو تم کر رہے ہو۔‘‘، (البقرہ 2 :237)

’’ایمان والو، تمھارے لیے جائز نہیں کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ (نکاح کر لینے کے بعد) جو کچھ تم نے اُن کو دیا ہے، اُس کا کچھ حصہ واپس لینے کے لیے اُنھیں تنگ کرو۔ ہاں، اِس صورت میں کہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کریں۔ اور اُن سے اچھا برتاؤ کرو، اِس لیے کہ اگر تم اُنھیں ناپسند کرتے ہو تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو اور اللہ اُسی میں تمھارے لیے بہت کچھ بہتری پیدا کر دے۔‘‘، (النساء 4 :19)

’’اور اُس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اُس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کرو اور اِس کے لیے اُس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔‘‘، (الروم 30:21)

’’مرد عورتوں کے سربراہ بنائے گئے ہیں، اِس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے اور اِس لیے کہ اُنھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ پھر جو نیک عورتیں ہیں، وہ (اپنے شوہروں کی) فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اِس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔‘‘، (النساء 4:34)

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ(68)

توپ کاپی

ائر پورٹ سے توپ کاپی کے راستے سے میں واقف تھا کیونکہ گوگل ارتھ پر یہ راستہ میں تفصیل سے دیکھ چکا تھا۔ سڑک پر لگے سائن بورڈز کے مطابق ڈرائیو کرتے ہم کچھ دیر میں شہر کی فصیل سے گزر کر توپ کاپی جا پہنچے۔ استنبول شہر کی فصیل ''رومیلی حصار'' کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر سلطان محمد فاتح نے کی تھی۔ توپ کاپی ایک وسیع علاقے کا نام تھا جس میں استنبول کے اساسی تاریخی آثار موجود ہیں۔ یہ ایک طویل سڑک تھی جس کے اطراف میں دکانیں اور پلازے بنے ہوئے تھے۔ سڑک کے بیچوں بیچ ''مونو ریل'' کی پٹریاں تھیں۔ ان پر دو بوگیوں والی ٹرینیں چل رہی تھیں۔ یہ ٹرام کی جدید شکل تھی۔ ٹرین کے دونوں جانب انجن تھا۔ جدھر جانا ہو، اس طرف کا انجن چلا لیجیے۔ مونو ریل اور سڑک کی ٹریفک کو اشاروں کے ذریعے کنٹرول کیا جا رہا تھا۔

یہاں واقعی ہر جانب ہوٹل ہی ہوٹل تھے۔ کچھ دیر کے بعد ایک ہوٹل پسند آ گیا۔ ہوٹل کے قریب ہی ایک چارجڈ پارکنگ تھی۔ وہاں گاڑی کھڑی کر کے ہم کھانا کھانے کے لئے نکلے۔ قریب ہی ایک باربی کیو ریسٹورنٹ تھا۔ یہاں پہنچتے ہی ایک گھاگ قسم کے بیرے نے بالکل اسی انداز میں اپنے کھانوں کی تعریف شروع کر دی جیسے ہمارے شاعر اپنی محبوبہ کی تعریف کرتے ہیں۔ ہماری شکلوں کو دیکھتے ہوئے آخری مصرعہ یہ فٹ کیا کہ ''یہاں حلال کھانا ملتا ہے۔''

اس ہوٹل کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں انیسویں صدی کے زمانے کے استنبول اور دیگر ترک شہروں کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ افسوس کہ ہم کیمرہ گاڑی میں بھول آئے تھے، ورنہ ان تصاویر کی

مزید تصاویر لے لیتے۔ کھانا مزیدار تھا۔ فارغ ہوکر گاڑی قریب ہی ایک چارجڈ پارکنگ میں کھڑی کی۔ وہاں موجود صاحب نے پہلے تو قومیت پوچھی۔ پاکستانی ہونے کے باعث انہوں نے دس کے بجائے پانچ لیرا وصول کیے۔ اب ہم اپنے کمرے میں آ گئے۔ رات کے دس بج رہے تھے اور استنبول شہر بھی ویران ہو رہا تھا البتہ اس کی ویرانی دیگر شہروں کی نسبت کم تھی۔

اگلی صبح ناشتے میں وہی لکڑی والے بن اور شہد سے گزارا کیا۔ میں بڑی تگ و دو کے بعد ہوٹل کے ملازمین کو کسی نہ کسی طرح یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گیا کہ میں فلائٹ میں اپنی سیٹ جلدی کی تاریخ میں کروانا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد انٹرنیٹ کے ذریعے سعودی ائرلائن کے دفتر کا نمبر معلوم کیا اور انہیں فون کیا۔ مجھے امید نہ تھی کہ وہ فون اٹھالیں گے اور اگر اٹھالیں گے تو میری بات سمجھ سکیں گے مگر انہوں نے نہ صرف فون اٹھایا بلکہ وہاں موجود صاحب نے نہایت ہی اچھے طریقے سے بات سنی، سمجھی اور فون پر ہی اگلے دن کی سیٹ کنفرم کردی۔

اب پارکنگ سے گاڑی لے کر ہم استنبول کی سیر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اچھی بات یہ تھی کہ یہاں کی تمام قابل ذکر جگہیں ایک ہی مقام پر واقع تھیں۔ ویسے تو پورا استنبول ہی مسجدوں کا شہر ہے مگر ہم ایک دن میں تمام مساجد دیکھ نہ سکتے تھے اور ویسے بھی ان مساجد کا آرکیٹیکچر بالکل ایک جیسا ہے۔ یہاں اتنی زیادہ تاریخی مساجد ہیں کہ گویا ہر بادشاہ اور اس کے افسر نے ایک مسجد بطور نشانی تعمیر کی تھی۔ ہر مسجد کے نام کے ساتھ کسی نہ کسی پاشا کا نام لگا ہوا تھا۔

سائن بورڈز کے مطابق چلتے ہوئے ہم پہلے ساحل یولو پر آئے اور اس کے بعد ایک تنگ سی گلی میں گھس گئے جو سیدھی فصیل کے اندر جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں ہم تاریخی ایریا میں پہنچ گئے۔ ایک گلی میں بمشکل پارکنگ ملی جو کہ ڈھائی لیرا فی گھنٹہ کے حساب سے تھی۔

سلطان احمد مسجد

پارکنگ سے نکل کر جیسے ہی ہم آگے بڑھے تو ایک نہایت ہی عالیشان مسجد ہمارے سامنے تھی۔ یہ سلطان احمد مسجد تھی۔ ہمارے دائیں جانب ''آیا صوفیہ'' کا گرجا، مسجد یا عجائب گھر تھا۔ آیا صوفیہ اور سلطان احمد مسجد کے درمیان ایک وسیع اور سرسبز پارک بنا ہوا تھا۔ ہم مسجد کی جانب بڑھنے لگے۔ ڈھیروں ڈھیر سیاح مسجد کے اندر جا رہے تھے۔ انہیں صرف مسجد کے بیرونی صحن تک جانے کی اجازت تھی۔ اس سے آگے ٹورسٹ پولیس کے اہل کار تھے جو صرف معقول لباس والوں کو ہی آگے جانے دے رہے تھے۔ بیرونی صحن پتھر کی سلوں سے بنا ہوا تھا۔

ہم لوگ پہلے مسجد کے بیرونی صحن میں پہنچے۔ یہاں ایک بوڑھی سکھ خاتون بیٹھی ہوئی تھیں اور اپنے بیٹے سے مشرقی پنجاب کے ٹھیٹھ پنجابی لہجے میں کچھ کہہ رہی تھیں۔ مسجد کے باہر پلاسٹک کے بیگ ایک رول میں لپٹے ہوئے تھے۔ جو بھی اندر جانا چاہتا، وہ ان لفافوں میں اپنے جوتے ڈال کر لے جاتا۔ مسجد کے اندر داخل ہوئے تو ہر طرف نیلا ہی نیلا رنگ بکھرا ہوا تھا۔ مسجد کی چھت پر نیلے رنگ کا کام کیا گیا تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے بھی نیلے رنگ کے تھے۔ اگرچہ سنان کے آرکیٹیکچر کے تحت تعمیر کردہ مساجد کے اندرونی حصے میں زیادہ تر نیلے رنگ کا استعمال ہی ہوا ہے مگر اس مسجد کو اہل مغرب نے ''نیلی مسجد'' کے نام سے مشہور کر دیا ہے۔

یہ مسجد 1609-1616ء کے عرصے میں سلطان احمد کے حکم سے تعمیر کی گئی۔ اہل مغرب اسے عثمانی دور کے آرکیٹیکچر کا شاہکار قرار دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس مقام پر بازنطینی بادشاہوں کے محل موجود تھے۔ مسجد کو سنان کے ایک شاگرد محمد آغا نے ڈیزائن کیا۔

آج جمعہ کا دن تھا۔ جیسے ہمارے ہاں نماز جمعہ سے پہلے مسجدوں میں بچے تلاوت و نعت شروع کر دیتے ہیں، ویسے ہی یہاں بھی تلاوت کلام پاک جاری تھی۔ میں نے ایک پولیس والے سے نماز کے وقت کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ نماز ایک بجے ہو گی۔ گویا ابھی نماز

میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس وقت میں کوئی اور جگہ دیکھ لی جائے۔ چنانچہ مسجد سے باہر آ گئے۔

اب ہمارا رخ مسجد کے مغربی جانب تھا۔ یہاں ایک ٹورسٹ انفارمیشن سنٹر بنا ہوا تھا۔ میں نے ان سے پانی میں بنے ہوئے ستونوں کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بڑے اچھے طریقے سے اس کا رخ سمجھا دیا۔ کہنے لگے، یہ صرف دومنٹ کے فاصلے پر ہے۔ یہاں سے مجھے استنبول کا ایک سیاحتی نقشہ بھی مل گیا۔

ملین مینار اور باسیلیکا سسٹرن

مونوریل کی پٹریاں پار کر کے ہم دوسری جانب آ گئے۔ یہاں ایک طویل مینار بنا ہوا تھا۔ اس کا نام ''ملین'' تھا۔ یہاں بورڈ پر درج تھا کہ چوتھی صدی عیسوی میں یہ مینار سلطنت روم کے مرکز کے طور پر تعمیر کیا گیا اور اسے مرکزی نقطہ مان کر یہاں سے سلطنت کے طول و عرض کی پیمائش کی گئی۔

مینار کے دوسری طرف ''باسیلیکا سسٹرن'' کا عجوبہ تھا۔ یہ کیا چیز تھی؟ تارڑ صاحب کے الفاظ میں سنیے:

''ٹکٹ خرید کر ہم جھونپڑی کے اندر داخل ہو گئے۔ دروازے کے ساتھ ہی لکڑی کی سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ ہم نیم تاریکی میں آہستہ آہستہ نیچے اترے۔ ہمارے سامنے کانسطنطائن کا زیرزمین آبی محل کھڑا تھا۔ تین سو چھتیس مرمریں ستون جو کمر تک گہرے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ محل کی چھت سے پانی کی بوندیں رس رس کر ستونوں کے اس وسیع تالاب میں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں جیسے جل ترنگ بج رہا ہو۔ سیڑھیوں کے قریب چند ستونوں پر بجلی کے قمقمے ٹمٹما رہے تھے لیکن اس سے پرے مکمل تاریکی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک پراسرار جھیل میں سینکڑوں ستون اگ آئے ہیں۔''

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حناؔ

غزل

محبت ان سے مت کرنا جو بے حس ہیں زمانے میں
وگرنہ عمر لگ جائے گی رشتوں کے نبھانے میں

انا کا خون ہوتا ہے، مگر یہ بھی ضروری ہے
کسی کی مان جانے میں، کسی کو خود منانے میں

یہ دستورِ زمانہ ہے یہاں ایسا بھی ہوتا ہے
کسی کی جیت ہوتی ہے، کسی کے ہار جانے میں

ذرا سا دِل بھی ڈرتا ہے، ذرا سا وقت لگتا ہے
کسی کے پاس آنے میں، کسی کے دور جانے میں

خیالوں کے درو دیوار پر، ہر سو جدھر دیکھوں
انہی کا عکس ملتا ہے، میرے آئینہ خانے میں

لہو ارزاں بہت ہے آجکل انساں کی بستی میں
ذرا سی دیر لگتی ہے کسی کا خوں بہانے میں

کوئی خوفِ خدا ہے نہ، تردّد ہے ذرا کوئی
کسی کا دِل دُکھانے میں، کسی کا مال کھانے میں

یہ میرے شہر کا نوحہ ہے، یا تازہ غزل میری
کہ ساری رات ہو جائے گی، سننے میں، سنانے میں

تکبّر، کبر و نخوت، ظلم دنیا کا طریقہ ہے
محبت، درگزر، رحمت ہے آقا کے گھرانے میں

حناؔ لمبی مسافت چل کے آئی ہے تو جانا ہے
گنوا دی عمر یہ میں نے، اسے اپنا بنانے میں

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

فون: 0332-3051201, 0345-8206011

ای میل: globalinzaar@gmail.com

web: www.inzaar.org

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوایئے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

کراچی کے لیے 500، بیرون کراچی کے لیے 400 روپے کا منی آرڈر ہمارے پتے پر ارسال کیجیے...... یا ایک پے آرڈر / بینک ڈرافٹ بنام "ماہنامہ انذار" بینک الفلاح المحدود (صدر برانچ)
اکاؤنٹ نمبر 0171-1003-729378 کے نام بھجوایئے
رسالہ آپ کو گھر بیٹھے ملتا رہے گا

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے
2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوایئے
3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

ایجنسی لینے کا طریقہ کار:

ایجنسی کے لیے ہر ماہ کم از کم پانچ رسالے لینا ضروری ہے

ایجنسی کا ڈسکاؤنٹ **20** فیصد ہے

ایجنسی لینے کے لیے اوپر دیئے گئے پتے پر رابطہ کیا جاسکتا ہے

Monthly
INZAAR

OCT 2019
Vol. 07, No. 10
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,
25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi